مزدوروں اور کسانوں کا وہ نعرہ جو
ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان میں
لگایا اور اس کی بازگشت کرشن چندر
کی زبانی بھارت میں سنی گئی

روٹی
کپڑا
اور
مکان

کرشن چندر

بھارت ادبی انعام یافتہ ۱۹۷۴ء

دنیا کے تین ارب بھوکے انسانوں کا احتجاج

روٹی کپڑا اور مکان

کرشن چندر

ناشران :- انتخاب ادب
۱۰ ایبک روڈ
انارکلی لاہور

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ناشر ———— بلیغ الدین جاوید

مطبع ———— القائم آرٹ پریس لاہور

سرورق ———— جاوید

تعداد ———— ایک ہزار

پاکستان میں پہلی بار ———— ۱۹۷۴ء

قیمت ——— سات روپے صرف

ناشران

انتخاب ادب ۱۰- ایبک روڈ لاہور

اِنتساب

تین ارب بھوکے انسانوں کے نام

صدیوں سے جن کا یہ نعرہ بے اثر ہے

جنتا کے ہیں تین نشان!

روٹی، کپڑا، اور مکان!

مگر یہ تخت یہ سُلطاں یہ بیگمات یہ قصر
مؤرخین کی نظروں میں بے گناہ رہے
بفیضِ وقت اگر کوئی راز کھُل بھی گیا
زمانے والے طرفدارِ کج کلاہ رہے

ستم کی آگ میں جلتے رہے عوام مگر
جہاں پناہ ، ہمیشہ جہاں پناہ رہے

احمد فراز

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مانوس ہونے پر بھی میں شہر والوں سے نامانوس ہوں اور بالعموم شہر سے باہر رہنے کی کوئی جگہ تلاش کر لیتا ہوں جہاں کھیت درخت پہاڑ اور سمندر میرے سامنے رہیں میری زندگی کے علاوہ میرے ادب میں جو احساس جمال کسی کو ملتا ہے اس کا منبع یہی فطرت ہے واقعیت اور حقیقت نگاری کا پہلا درس بھی مجھے ایک طرح سے فطرت ہی نے دیا۔

کشمیر کی خوبصورت وادیوں اور مرغزاروں میں رہنے والوں کی مصیبت مجبوری بے چارگی اور غربت کا تضاد اس قدر واضح اور شدید تھا کہ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا۔ کہ ایسا کیوں ہے، اس کے اسباب وعلل پر غور کرنے کا جو سلسلہ چلا جو بہت دور تک پہنچا اور ابھی آگے کہاں جائے گا۔ یہ میں آج نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا ضرور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میری زندگی میں گو کہ بہت بعد میں آیا پہلے تو فطرت ہی آئی اور پہلے تو صرف اس کے حسن نے اس کے سطحی حسن نے مجھے متاثر کیا بعد میں جب غور کرنے کی عادت جڑ پکڑنے لگی تو میں نے دیکھا کہ فطرت کے حسن کے اندر بھی پھولوں کی شوخ رنگی بلبل کی نغمہ سرائی اور بھونروں کی بھنک کے انداز بھی ایک مربوط منظم مقصد کار فرما ہے اس سے پہلی بار مجھے یہ خیال آیا کہ اگر فطرت بے مقصد نہیں ہے تو انسان بھی بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ اس کی زندگی اس کا سماج اس کا ادب بھی بے مقصد نہیں ہو سکتے۔

ظاہر ہے فطرت میں تخلیق ہے تو تخریب بھی ہے وحشت ہے تو سکون بھی ہے جبر

مسلسل کے ساتھ مفاہمت بھی رواں دواں ہے لیکن ان تمام مختلف عناصر کو نظام فطرت نے ایک ایسے توازن سے باندھا ہے جسے دراصل خوبصورتی سے تعبیر کرنا چاہیئے اور اسی توازن کو میں حسن کہتا ہوں اور جب میں انسانی سماج میں حسن لانے کو کہتا ہوں تو میرے ذہن میں سطحی حسن کے بعد جو حسن کی دوسری تصویر آتی تھی وہ اسی فطری توازن کے حسن کی تھی جسے میں انسانی زندگی میں جاری و ساری دیکھنا چاہتا ہوں گویا میری زندگی کے یہ سوچنے سمجھنے میرے ادراک اور فلسفے کے پہلے اصول فطرت نے مرتب کیے ہیں۔

فطرت کے بعد سائنس آتی ہے —— اسکول میں پڑھائی جانے والی ابتدائی سائنس نے —— آپ اسے شخصیت کہہ لیجئے یا واقعہ —— مجھے بے حد متاثر کیا اس کا طریقہ استدلال اور استخراج مجھے آج بھی یاد ہے جو اشیاء کو اجزاء میں تقسیم کر دیتا ہے اور پھر ان اجزا کو ایک مرکب میں باندھ دیتا ہے اور اسی طرح تخلیق اور تخریب کے اصولوں کو سمجھنے کی عقلی کوشش کرتا ہے کسی شے کی آخری ماہیت شاید سائنس ابھی معلوم نہیں کر سکتی لیکن وہ اس دروازے تک تو پہنچ سکتی ہے جسے حرف آخر کہنا چاہیئے۔ اور جس کی چابی سائنس کے پاس بھی نہیں ہے۔ لیکن سائنس میں تو یہ خوبی ہے کہ وہ کسی حرف آخر کو آخر نہیں سمجھتی —— مذہب کی طرح۔ ایک ایٹم کو توڑنے سے لاکھوں نئی دنیائیں آباد ہوتی ہیں اور برباد ہوتی ہیں اور سائنس کو اپنی تگ و دو کے لئے نیا میدان مل جاتا ہے۔ لیکن مذہب اور ہر مذہب اپنی قطعیت

میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے اور مذہب کی یہی بات مجھے سب سے زیادہ ناپسند ہے
سائنس نے مجھے مذہبی ہونے سے بچالیا اور اس حد تک بچایا کہ آج بھی سائنس کے کئی
اصولوں اور کئی دریافتوں کو شبے کی نظر سے دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں آج تو تم کہتے ہو
یہ سچ ہے۔ کل کو خدا جانے کیا سچ ہو۔

سائنس نے میرے بہت سے اوہام دور کیے ہیں ذہن کے بہت سے پرانے جالوں کو
صاف کیا اور شکوک کے کئی نئے جالے دیئے (ایسا مجھے ہوتا ہے) لیکن سائنس میری زندگی
میں اس لیے اہم ہے کہ اس نے میری فطرت پسندی کو ایک نئی شکل دی ہے اس
سے پہلے میرے ذہن میں انسانی سماج کی صعوبتوں کو دور کرنے کا اگر کوئی منصوبہ تھا
تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ انسان کو فطرت سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ سادہ زندگی
اختیار کرنی چاہیئے۔ شہری چالاکی سے بچنا چاہیئے زیادہ مشینیں انسان کے لئے مفید
نہیں ہیں ـــــ یعنی ٹالسٹائی یا گاندھی۔ مگر بہت جلد یہ خیال دور ہو گیا اور سائنس
کے مطالعے سے یہ معلوم ہوا کہ فطرت کے راز معلوم کرکے ہم انسانی سماج میں فطرت کا سا
توازن لاتے ہوئے فطرت سے کہیں بہتر نظامِ زندگی مرتب کر سکتے ہیں یعنی انسان
اپنی عقل و دانش سے فطرت پر اضافہ کر سکتا ہے سادہ زندگی کی بجائے بھرپور اور
پیچیدہ زندگی اختیار کر سکتا ہے شہر اس طرح وسیع اور کھلے آباد کیے جا سکتے ہیں کہ ہر
گام پر فطرت کا شبہ ہو اور یہ سب کام مشینوں کے بغیر ممکن نہیں۔

فطرت اور سائنس کے بعد میری زندگی کا تیسرا موڑ ادب ہے اہم موڑ اشتراکیت کی

آمد ہے وہ خیال جو روس میں انقلاب کے بعد ایک دھماکے کی طرح ساری دنیا میں پھیلا اور ساری دنیا کے نوجوان اذہان نے اس کی گونج سنی کالج کے پہلے سال ہی میں جہاں میں نے سائنس کے مضامین لیے وہاں میں نے مارکس، لینن اور اینگلز کی تعلیمات کا مطالعہ بھی شروع کیا ایک طرف دہشت پسندوں سے رابطہ قائم کیا تو دوسری طرف سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے علمی اور سیاسی مجلسوں میں شریک ہونے لگا۔ وطن کی آزادی میرے سامنے صرف ایک ملک کی آزادی کی شکل میں نہ آئی بلکہ اسے میں نے ایشیا افریقہ جنوبی امریکہ بلکہ خود یورپ کے بیشتر حصوں کے کروڑوں عوام کی آزادی کی تحریک کی صورت میں دیکھا جو ایک مخصوص نظام زندگی کے چنگل سے نکل کر ایک بہتر دنیا کی تعمیر کے خواب دیکھ رہی تھی

ظاہر ہے کہ اس طرح کی آزادی کا تصور کانگریس کے پاس نہ تھا، نہ مہاسبھا اور اکالی دل کے پاس نہ تھا —— یہ بات نہیں تھی کہ ان جماعتوں کی اہمیت سے ناواقف تھا یا ان کے پیچھے کارفرما تاریخی قوتوں کے وجود سے منکر تھا لیکن میرے لیے ان کی دلچسپی محدود تھی میں انہیں عوام کے نمائندے ان معنوں میں نہ سمجھتا تھا جن معنوں میں اکثر لوگ سمجھتے ہیں یعنی یہ ایسے لوگ ہوں گے یا یہ ایسی جماعتیں ہوں گی جو ملکوں اور قوموں کو سامراجی نظام زندگی سے آزاد کرا کے ایک نئے نظام زندگی کی بنیاد ڈالیں گی۔ میں نے ان جماعتوں کی محدودیت کو سمجھ کر بھی کبھی انہیں اپنا رہنما یا راہبر نہ جانا ان سے زیادہ توقع نہ رکھی لیکن اگر

کبھی ان سے کوئی حسین کام ہو بھی گیا تو میں حیرت میں رہ گیا۔ آئیں۔ ان لوگوں سے تو اس حسن سلوک کی امید نہ تھی ــــ یہ کیسے ہو گیا۔ اس بات کا مجھے ہمیشہ یقین نہ رہا کہ ہمیں ان لوگوں کے ساتھ مل کر کام تو کرنا ہوگا اور ان کے ساتھ مل کر ہی ملک کو آزاد کرانا ہوگا۔ لیکن آزادی کے بعد بھی یہ لوگ ہمیں نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ ممکن ہے انگریزوں سے زیادہ بہتر طریقے سے زیادہ سلیقے سے کھائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مرغ کو بوٹی کرکے کھائیں۔ لیکن کھائیں گے ضرور۔ اس لئے میں گاندھی، جواہر لال، جناح یا گولوالکر کی تعلیمات کو اس روحانی تقدس کے ہالے میں نہ دیکھ سکا جس طرح بہت سے باشعور لوگوں نے دیکھا ــــ اور آج بھی دیکھتے ہیں۔

جس طرح کوئی خیال جزو ایمان بن جاتا ہے اسی طرح اشتراکیت نے مجھے اس حد تک متاثر کیا کہ وہ میرے بنیادی عقائد کا مرکز بن گئی۔ اور میرے فلسفۂ حیات کا سب سے روشن پہلو لیکن اس کا کیا کیجئے کہ ہر چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے اور ہر روشنی اپنا سایہ ساتھ لاتی ہے۔ میں آج بھی اشتراکیت کے راستے پر اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق چلتا ہوں ــــ کام کرتا ہوں۔ اور لکھتا ہوں لیکن میں اس کا اندھا مقلد نہیں ہوں۔ اشتراکیت بیسویں صدی کا مذہب ہے۔ مذہب ان معنوں میں کہ ہر مذہب تاریخ میں اپنا دور حیات ایک مخصوص نظام زندگی ایک مخصوص حلقہ اور فکر لے کے آتا ہے اور اس کی ترویج اشاعت کرنے میں اور کروڑوں انسانوں کو اپنا ہمنوا

بنانے میں کوشاں رہتا ہے۔ اور تاریخ کے اس موڑ پر انسانیت میں اضافے کا باعث ہوتا
ہے۔ یہ سب باتیں میں اشتراکیت میں دیکھتا ہوں۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے۔ کہ
سرمایہ داری اپنا کام کر چکی۔ اب اگلے سو سال یا ڈیڑھ سو سال یا دو سو سال تک
انسانی سماج کو لامحالہ اپنی بہتری کے لئے اشتراکیت کے راستہ پر چلنا ہوگا۔ اس امر
کا ایک بہت واضح تصور میرے ذہن میں موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں اشتراکیت
کو انسانی فلسفے اور نظام حیات کا حرف آخر سمجھنے سے قاصر ہوں اس کے اندر روشنیاں
ہیں تو سائے بھی ہیں ایک زمانہ ہوتا ہے جب ہر فلسفہ شہید دل کی تحریک ہوتا ہے
اشتراکیت کی تحریک آج دنیا بھر میں شہید دل کی تحریک سے آگے جا چکی ہے
آج دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی سوشلزم میں اپنی راہ نجات دیکھتی ہے۔ اور
یہ تعداد بڑھتی جائے گی ـــ اب اشتراکیت کی تحریک اس منزل اور اس موڑ پر
آگئی ہے۔ کہ خود اس کی بہبودی کے لئے سختی سے اس کا محاسبہ کیا جائے اور جدید
سائنسی انکشافات کی روشنی میں اور ماضی کے تجربوں کی بنا پر اس پر کڑی
سے کڑی تعمیری تنقید کی جائے ورنہ اس بات کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے کہ جب
کوئی تحریک اس حد تک پھیل گئی تو اس میں مذہبیت کے عناصر شامل ہو جاتے
ہیں وہ عناصر جو اسے بت بناتے ہیں اور خدا اس کا مقدس کلام، رسوم اور روائتیں
پجاری اور پیروکار اس طرح سے اس کے ارتقاء کی رفتار کو کم کرتے ہیں اس
خطرے سے بچنا ہوگا۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اشتراکیت متحمل ہونے پر اگر اس کے

روایت پسند و خوشامدیوں کی تعداد بڑھے گی تو اس کے اپنے ہی بطن سے اس
کے زیادہ سے زیادہ نقاد بھی پیدا ہوں گے۔ اس کی صورتیں بدلے گی اور وہ بدلتی
ہوئی صورتیں اشتراکیت کے موجودہ اور مروجہ سماجی اداروں کو بھی بدلے گی اور
وہ بدلتی ہوئی اور سماج کی ترقی کے لئے ایک نیا فلسفہ وجود میں آئے گا۔ یوں تو
ہوگا ہی اور اسے کوئی روک نہ سکے گا۔ خود اشتراکیت بھی اسے روک نہ سکے گی

بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں جو بظاہر بے حد معمولی ہوتی ہیں میں
نے اپنے والد سے سیکھی ہیں یعنی طے شدہ امور کو غیر طے شدہ سمجھنا۔ زندگی کی
چھوٹی چھوٹی خوبصورتیوں سے حظ اٹھانا۔ اپنے مخالفوں کی عزت کرنا اور ان کی
باتوں کو انتہائی غور سے سننا۔ بڑے آدمیوں پر اعتبار نہ کرنا اور عام لوگوں
سے میل جول رکھنا اور ان پر زیادہ بھروسہ کرنا۔ میرے والد کو ایک ذہین اور قابل
ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے راجاؤں اور مہاراجاؤں سے واسطہ پڑتا تھا۔ لیکن وہ ان کی
صحبت پر ہمیشہ معمولی آدمیوں کے ساتھ کو ترجیح دیتے تھے۔ اور ان کے ملازم ہوتے ہوئے
بھی اپنی نجی گفتگو میں ان سے شدید نفرت کا اظہار کیا کرتے تھے اور اپنی فرصت
کے اوقات باغ کے مالی سے راہ چلتے ہوئے کسی نادار راہ گیر سے یا کھیتوں میں کام
کرتے ہوئے کسانوں سے گفتگو کرنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ مجھے بھی اپنی چھوٹی سی
زندگی میں ہندوستان کے کئی عظیم الشان شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے
اور اکثر میں نے ان کو نہایت تنگ نظر، خود غرض مکار اور جاہ پرست پایا ہے۔ ان سے

زیادہ انسانیت رواداری اور خلوص میں نے ان لوگوں میں پایا ہے۔

وہ اکثر کہا کرتے تھے۔ انسان کو انسان کی طرح رہنا چاہیے۔ فرشتہ کی طرح نہیں اس نے تھوڑا سا گناہ کر لو۔ تھوڑی سی غلط کاری بھی بری نہیں تھوڑی سی بے راہ روی بھی جائز ہے۔ بظاہر یہ بات کس قدر غلط معلوم ہوتی ہے لیکن زندگی کے تجربوں نے اس کی صداقت بھی عیاں کر دی۔

پہلی ادبی کتاب جو میں نے پڑھی وہ الف لیلے کا اردو ترجمہ تھا۔ یہ تیسری جماعت کا قصہ ہے والد ادبی کتابیں پڑھنے سے منع نہیں کرتے تھے لیکن والدہ کو سخت اعتراض تھا۔ الف لیلے کے بعد میں نے سدرشن کی کہانیاں پڑھیں پھر پریم چند کی کہانیاں میٹرک تک میں نے بہت سا اردو ادب کھنگال ڈالا میٹرک میں ٹیگور انگریزی میں پڑھا اس کا اثر بہت دیر تک دل و دماغ پر رہا۔ انقلاب روس سے پہلے کے بڑے بڑے روسی ادیبوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا پشکن گوگول میری مونتوف گورکی تک روسی ادب اتنا اچھا اور عمدہ ہے کہ دوسری زبان کے ادب میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی پرانے ادیبوں میں جن لوگوں کو بار بار پڑھ سکتا ہوں اور پڑھتا ہوں وہ شیکسپیر اور غالب ہیں۔

موجودہ یورپی ناول نگاروں میں شولوخوف انسٹین ہمنگ وے اور ہاورڈ فاسٹ بہت پسند ہیں اجنتا کی میں تعریف کرتا ہوں لیکن گذشتہ چار سو سال میں یورپی مصوروں نے جو سرمایہ انسانی کلچر کو دیا ہے۔ وہ اس قدر عظیم ہے کہ اس

سے متاثر نہ ہونا گناہ کبیرہ معلوم ہوتا ہے — ہاں کہا جوراڈ اور اپنا کے تب کلاسیکی
یونانی اطالوی نشاۃ الثانیہ اور ماڈرن یورپی سنگ تراشوں اور صنم گروں کی
تخلیقات کے ہم پلہ ہیں۔ اور کہیں ان سے بڑھ کر جاتے ہیں بالعموم شعرا میں
یورپ کے نثر نگاروں کے لکھنے کے ڈھنگ سے متاثر ہوں اور شاعری میں مشرقی
شاعروں کی ادا کا تتبع ہوں۔ اور تتبع تو جانے کس کس کا ہو کیونکہ ہر نیا
روز ایک نیا سورج لے کر آتا ہے۔

دیباچہ

کرشن چندر اردو کا سب سے بلند قامت افسانہ نگار ہے ویسے اس کا قد چھوٹا ہے جس پر کسی خوش مذاق نے یہ پھبتی کہی تھی کہ اردو ادب پر بونے سوار ہیں وہ کسی دیباچے یا تقریظ کا محتاج نہیں ہے پھر بھی اس نے نہ جانے کیوں مجھ سے اپنی نئی کہانی پر دیباچہ لکھنے کی فرمائش کی اور میں اس لئے ٹال نہ سکا کہ میں کرشن کی کوئی بات نہیں ٹالتا۔ اب یہ سوچ کر گھبراتا ہوں کہ کرشن کے میدان میں اس کے دوش بدوش چلنے کی کوشش میں بڑی جگ ہنسائی ہوگی۔ سچی بات یہ ہے کہ کرشن کی نثر پر مجھے رشک آتا ہے وہ بے ایمان شاعر ہے جو افسانہ نگار کا روپ دھار کے آتا ہے اور بڑی بڑی محفلوں اور مشاعروں میں ہم سب ترقی پسند شاعروں کو شرمندہ کر کے چلا

جاتا ہے وہ اپنے ایک ایک جملے اور فقرے پر غزل کے اشعار کی طرح داد لیتا ہے اور میں دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوں کہ اچھا ہوا اس ظالم کو مصرعہ موزوں کرنے کا سلیقہ نہ آیا اور نہ کسی شاعر کو پنپنے دیا۔

کرشن کی نظر میں گہرائی اور تخیل میں بلا کی اڑان ہے تحریر میں سیلاب کا سا بہاؤ ہے اور اثر انگیزی بے پناہ ہے دشمن اور نکتہ چیں بھی اس کے قائل ہیں۔ میں اس کی تحریر کو 'سیلابِ حسن' کہتا ہوں جسے ڈاکٹر ملک راج آنند نے 'شاعرانہ حقیقت نگاری' کا خوبصورت نام دیا ہے اس پر حیرت نہ ہونی چاہیئے۔ کہ جو حسن کرشن کی کہانیوں میں ہے کہیں پایا نہیں جاتا۔ وہ اس جادوگر کی تخلیق ہے۔ شاعرانہ تخلیق کے یہی معنی ہیں۔ جیسے چاندنی ہر چیز کو پُراسرار اور حسین بنا دیتی ہے ویسے ہی کرشن اپنے تخیل کے نور سے حقیقت میں ایسا پُراسرار حسن پیدا کر دیتا ہے۔ جس کا طلسم ٹوٹتا ہی نہیں۔ فطرت کے حسن پر یہ اضافہ معمولی کارنامہ نہیں ہے اردو حلقوں کو اس پر فخر کرنا چاہیئے۔ کہ ان کی زبان نے ـــــ جسے دیس نکالا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے ایک ایسا عظیم فنکار پیدا کیا ہے جو سارے ہندوستان کو محوِ حیرت کر دے گا۔

میں ان لوگوں سے متفق نہیں ہوں جن کا یہ خیال ہے کہ کرشن کا شاعرانہ انداز بیان افسانے کو افسانہ نہیں رہنے دیتا میرا خیال یہ ہے کہ اس سے اثر آفرینی بڑھ جاتی ہے اور یہ انداز بیان اس کی کہانیوں کے مواد اور موضوع کے ساتھ اس طرح

وابستہ ہے جیسے پھول کے ساتھ رنگ اور رنگ کے بغیر پھول کا کوئی تصوّر ممکن نہیں ہے یہ صحیح ہے کہ شاعری میں الفاظ کی اہمیّت افسانے سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ان کی موسیقی اور معنویت براہ راست جذبات کو متحرک کرتی ہے جبکہ افسانے میں الفاظ سے واقعات اور کرداروں کی تخلیق کی جاتی ہے اور پھر وہ واقعات اور کردار جذبات کو متحرک کرتے ہیں اس طرح افسانے میں الفاظ کی اہمیت ثانوی ہو جاتی ہے یعنی شاعری میں الفاظ کی ترتیب جذباتی ہو جاتی ہے اور افسانے اور نثر کی دوسری تحریروں میں منطقی لیکن کرشن الفاظ سے بہ یک وقت دونوں کام لیتا ہے اور افسانے کے منطقی تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے جذبات کے تاروں کو بھی چھیڑ جاتا ہے اس طرح کرداروں کی روح کی گہرائی سامنے آجاتی ہے اور حقیقت کے دل کی دھڑکنیں سنائی دینے لگتی ہیں۔

کرشن کی ادب نگاری نے پندرہ برس کی مختصر سی مدّت میں بڑی لمبی مسافت طے کی ہے وہ کشمیر کی پھولوں سے لدی اور ظلموں سے بھری ہوئی وادی میں پیدا ہوئی وہ شفق کے چشموں اور چاندنی کے آبشاروں میں نہائی اس نے سیب و بادام کے شگوفوں سے اپنے حسن کو سجایا اور برفانی طوفانوں کی راتوں اور بہار کی خوبصورت صبحوں کی آغوش میں مشق کیا —— وہ بھرے ہوئے کھیتوں میں لوٹی گئی —— بازاروں میں بکی اور زمینداروں کے گھروں میں کچلی گئی۔ اس نے پنجاب کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں ہیر گایا۔ شہروں کے اسکولوں اور

کالجوں میں تعلیم حاصل کی۔ راوی اور چناب کے کنارے خواب دیکھے جن کی،
تعبیریں وہم پرستی اور رسم و رواج کی چوکھٹ پر قربان ہوگئیں یا دفتروں میں زرد
کاغذوں کی طرح پیلی پڑ گئیں ـــــ اس کی افسانہ نگاری نے ہندوستان میں سامراجی
تشدّد جاگیرداری ظلم اور غلامانہ بربریت دیکھی۔ افلاس، جہالت، وہم اور دیوانگی
دیکھی۔ کہیں اس نے آنسو بہائے اور کہیں طنز کے تیز تیر چلائے اور کہیں زمین کے
پھولوں اور آسمان کے ستاروں کو چنتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے لاہور، دہلی اور لکھنؤ
کی گلیوں میں آوارہ گردی کی ـــــ بمبئی کے کامگار میدان میں مزدوروں کے جلوسوں
میں شرکت کی اس نے ہڑتالوں میں لاٹھیاں اور گولیاں کھائیں۔ فرقہ وارانہ فسادات
میں وہ چھروں سے زخمی ہوئی ـــــ قحط میں بھوکی مری ـــــ جیل خانوں میں بند رہی،
پھانسی کے تختوں پر چڑھی اور افق دار کی اس بلندی سے اس نے ہمالیہ کے اُس
پار لینن اور اسٹالن اور گورکی اور ایلیا ہرن برگ کی وہ شفق رنگ سرزمین دیکھی
جہاں انسان پہلی بار مکمل طور سے آزاد ہوا ہے اس نے تاریخ کے چہرے سے
ماہ و سال کی نقابیں اٹھائیں ـــــ وقت کی رفتار کو پرکھا اور زمانے کے سینے
میں انسان کے سینے کا سوز ڈھونڈھ نکالا ـــــ اس نے ایک مرتی ہوئی دنیا دیکھی
جو اپنی تمام حماقتوں، خباثتوں اور نجاستوں کو لے کر عدم کے تاریک گڑھے میں
گری جا رہی ہے اور ایک نئی پیدا ہوتی ہوئی دنیا دیکھی جو سورج کی کرنوں اور
بہار کے شگوفوں کی طرح پھوٹ رہی ہے اور تخلیق کا وہ کرب اور تعمیر کی وہ حوصلہ

مندی دیکھی جو پرانے اور نئے کی کشمکش سے وابستہ ہے اس لئے کرشن کی کہانی میں ہندوستان کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہے جہاں سے اس نے اپنا خمیر حاصل کیا ہے اس کی رگوں میں وقت اور تاریخ کا خون ہے۔ اس نے روس اور چین سے اعتماد حاصل کیا ہے ـــــ اسپین سے شجاعت لی ہے ـــــ کوریا سے قربانی کا جذبہ اور شاعر کے تخیل سے اپنا لافانی حسن۔

اس طرح کرشن نے اس جمہوری حقیقت نگاری کو آگے بڑھایا ہے جس کی بنیاد پریم چند نے ڈالی تھی۔ پریم چند کی جولانگاہ ماضی سے حال تک تھی اور کرشن کی جولانگاہ حال سے مستقبل تک ہے۔

.... اب میں لڑنا چاہتا ہوں ـــــ اس ہنسی کے لئے لڑنا چاہتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ چین میں ایک کسان ہے لی اس کا نام ہے وہ اس ہنسی کے لئے لڑ رہا ہے اور میں نے یہ سنا ہے کہ انڈونیشیا میں ایک نورالدین کان کن ہے اور وہ اس کے لئے لڑ رہا ہے اور میں نے سنا ہے کہ یونان میں ایک لوہار ہے۔ مارکاس وہ اس کے لئے لڑ رہا ہے۔ اور میں نے سنا ہے کہ برما ملایا اور ہند چینی کے گھنے جنگلوں میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی اس کے لئے لڑ رہے ہیں ـــــ میں بھی اس ہنسی کے لئے لڑوں گا ـــــ اب میں ایک خوبصورت رقاصہ نہیں بننا چاہتا۔ ہنسانے والا مسخرہ بھی نہیں بننا چاہتا ـــــ کمزور احتجاج کرنے والا کلرک بھی نہیں بننا چاہتا ـــــ میں چاہتا ہوں کہ مجھے ایک موٹی سی

کارتوس کی گولی بنا دو اور مجھے وہاں بھیج دو جہاں انسان ـــــ انسان پر ظلم کے
خلاف لڑ رہا ہے ـــــ " دکھانی کی کہانی)
اور کرشن نے اپنے افسانے کو موٹی سی کارتوس کی گولی بنا کر وہاں بھیج دیا ہے
جہاں انسان، انسان پر ظلم کے خلاف لڑ رہا ہے اور یہ موٹی موٹی گولیاں بڑی
کارگر ہیں۔ جنہیں کرشن حقیقت کے پگھلے ہوئے سیسے اور تخیل کے بارود سے
بنا کر الفاظ کے کارتوس میں بند کر دیتا ہے اس سلسلے میں کرشن نے ایک سے ایک
اچھی کہانی لکھی ہے۔ ان داتا ـــــ تین غنڈے ـــــ پشاور ایکسپریس ـــــ بت جاگتے
ہیں ـــــ کالو بھنگی ـــــ پھول سرخ ہیں ـــــ مہالکشمی کا پل ـــــ برہم پترا میں
انتظار کروں گا اور پانی کا درخت صرف چند نام ہیں۔

کرشن چندر کی کہانیاں اس سامراجی پروپیگنڈے کی تردید کرتی ہیں کہ ہندوستانی
عوام کی حیثیت ایک بے حس اور بے عمل ہجوم سے زیادہ نہیں جن کی قسمت
میں یہی لکھا ہے کہ وہ بھوک اور بیماریوں سے مریں یا جنگ بازوں کی توپوں کا ایندھن
بنیں ـــــ کرشن جس ہندوستان سے محبت کرتا ہے وہ عوامی ہندوستان ہے جسے
کروڑوں انسانوں کی اجتماعی کوششوں نے تخلیق کیا ہے وہ ان کروڑوں معمولی انسانوں
کے بارے میں بڑی محبت اور گرم جوشی سے لکھتا ہے اور انہیں اپنے ملک کا سب
سے قیمتی خزانہ سمجھتا ہے اس کے شاعرانہ اندازِ بیان سے اپنے عوام کے روزمرہ زندگی
کی معمولی تفصیلات بڑی معنی خیز بن جاتی ہیں اور ہندوستانی عوام کے حال اور

مستقبل دونوں جھلک اٹھتے ہیں........ ایک تابناک مستقبل کا خواب جوان تمام کہانیوں میں جھلکتا ہے خود زندگی سے پیدا ہوا ہے اور حقیقت نے اسے پروان چڑھا ہے۔"
(سویت لٹریچر ۱۱ ۱۹۵۱ء)

پیش نظر مختصر ناول "روٹی کپڑا اور مکان" اس اعتبار سے کرشن کی اہم کہانی ہے کہ اس میں پندرہ سولہ سال کے بعد وہ کسان نئی شان سے واپس آیا ہے جس نے انتہائی بے چارگی کے عالم میں پریم چند کے ناول گئودان میں دم توڑا تھا اب یہ بے بس اور مصیبت زدہ کسان نہیں ہے بلکہ وہ بہادر چھاپہ مار ہے جو اپنی اور تمام کسانوں کی بے بسی اور مصیبت کو ختم کرنے کے لئے جدو جہد کر رہا ہے۔ یہ باشعور ہوش مند اور منظم کسان ہے جو دھرتی کی کوکھ سے ایک تناور اور مضبوط درخت کی طرح اگا ہے اور انقلاب بغاوت کی تیز و تند ہواؤں میں جھوم جھوم کر گیت گا رہا ہے:-

دیکھو، سارا تلنگانہ بیدار ہے
طبل بجاؤ ـــــ
جیت کے جلوس کی رہبری کرو ـــ
مورچہ جیت لو
آندھرا کے مٹے آؤ

اور جب ظلم کے ہاتھ ایک شاخ کو کاٹ دیتے ہیں تو اس کے زخم سے

سینکڑوں اور شاخیں اپنے ہاتھ باہر نکال دیتی ہیں اور یہ درخت بڑھتا جاتا ہے اونچا ہوتا جاتا ہے، پھیلتا جاتا ہے۔

اینگلز کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق نمائندہ حالات کی تصویر کشی حقیقت نگاری کی بنیاد ہے اور آج کے ہندوستان میں مزدوروں اور کسانوں اور درمیانی طبقوں کی جدوجہد ہی سب سے زیادہ نمائندہ حقیقت ہے جس کی ترجمانی کرشن بڑے خلوص سے کر رہا ہے اس سے لینن کا یہ اصول مرتب ہوتا ہے کہ ہر عظیم فنکار اپنے عہد کے انقلاب کے کسی نہ کسی پہلو کا ترجمان ضرور ہوتا ہے اور اب کرشن ہندوستانی جمہوری انقلاب کے سب سے اہم پہلو کا ترجمان بن رہا ہے اور اس لئے اس نے عظمت کی سرحدوں میں قدم رکھ دیا ہے جو لوگ حقیقت کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھنے کے عادی ہیں وہ صرف ظلم، ناانصافی، افلاس جبر اور تشدد کو حقیقت سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف ابھرنے والی عوامی تحریکوں کو حقیقت نہیں سمجھتے۔ وہ حقیقت کو متحرک شکل میں نہیں دیکھ سکتے۔ اور اس لئے صرف اس کی ظاہری شکلوں میں کھو جاتے ہیں اور اس کی گہرائیوں میں نہیں اتر سکتے انہیں اپنی کج نگاہی کی وجہ سے کرشن کا فن پروپیگنڈہ معلوم ہوتا ہے لیکن کرشن کے لئے حقیقت متحرک اور سیال ہے جو برابر تبدیل ہو رہی ہے اور اس کو تبدیل کرنے والا افسانہ ہے اس لئے اس کی نگاہیں حال کے پردوں کو چیرتی ہوئی مستقبل کے تابناک چہرے تک پہنچ جاتی ہیں۔

"روٹی، کپڑا اور مکان" کا ہیرو بائیس سال کا نوعمر کسان راگھو راؤ ہے جسے زندہ رہنے کا مقدس حق مانگنے کے جرم میں پھانسی دی گئی ہے کہانی اس کی زندگی کی آخری رات کو شروع ہوتی ہے اور یادوں کے کارواں بن کر گزرتی ہے وہ اپنی بیتی ہوئی زندگی کے لمحات کو سکوں کی طرح اٹھا اٹھا کر دیکھتا ہے اور کھوٹے کھرے کو الگ کرتا جاتا ہے وہ رات بھر ان سکوں کو گنتا رہتا ہے اور صبح جب سورج طلوع ہو رہا ہے پھانسی پر چڑھ جاتا ہے۔

یہ سیدھی سادی کہانی جو راگھو راؤ کی اپنی کہانی ہے ہندوستان کے کسی بھی بیدار کسان کی کہانی ہو سکتی ہے اس میں نہ تو اس قسم کا کوئی پلاٹ ہے جسے ادب کے کٹھ ملاؤں نے چوکھٹے کی طرح بنا کر رکھ دیا ہے اور نہ بیان میں کوئی پیچیدگی، حیرت و استعجاب ہے کہانی شروع ہوتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے چشمہ پہاڑ کی کسی چوٹی یا کسی جھیل سے پھوٹتا ہے، ندی بنتا ہے اور وادیوں اور میدانوں سے گزرتا ہوا سمندر میں مل جاتا ہے۔ راگھو راؤ ایک فرد ہے جو ایک کھیت مزدور ویریا کا بیٹا ہے جس نے ایک لڑکی سے محبت کی ہے جس کے دل میں خواہشیں ابھری ہیں جس نے خواب دیکھے ہیں نفرت اور غصہ کے جذبے کو محسوس کیا ہے اور اپنی زندگی کو بدلنے کا عہد کیا ہے لیکن راگھو راؤ تلنگانہ اور ہندوستان کے کسانوں کا نمائندہ بھی ہے جو دھرتی کا بیٹا ہے جس کے چہرے پر دھرتی کا سکون اور وقار ہے جس کے سینے میں عوام کا دل ہے اور انسان کی محبت ہے جس

نے کسانوں کی بہادری اور شجاعت دکھائی ہے اور جو سماج کو تبدیل کر دینے کا عہد کرکے میدانِ عمل میں اترا ہے یہی کردار نگاری ہے اور کرشن اس میں بہت کامیاب ہے۔

آپ جب اس کہانی کو پڑھیں گے تو راگھو راؤ کی رُوح آپ کو سینے میں آجائے گی۔ یہی اثر آفرینی ہے اور کرشن اس فن کا سب سے بڑا جادوگر ہے آج کے ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ ظالموں کی بزدلی کی گواہی اور مجاہدوں کی عظمت اور شہیدوں کی پاکیزگی کی شہادت دے اور کرشن نے اپنے فرض کو بڑی دیانتداری سے پُورا کیا ہے۔

یہ ناول تلنگانہ کے اس عظیم الشان رزمیہ کا ایک چھوٹا سا حصّہ ہے جو کہ ابھی لکھا نہیں گیا ہے لیکن کسی دن کوئی کرشن چندر جب اسے لکھے گا تو عہدِ حاضر کا ایک بہت بڑا شاہکار تخلیق کیا جائے گا۔

تلنگانہ قربانی اور ایثار جدوجہد اور شجاعت کی ایک بیمثل داستان ہے اور ہندوستان کی پُرانی کسان تحریک کے ارتقا کی آخری شکل ہے کسان صدیوں سے زمین میں بیج بو رہا ہے اور فصل اگا رہا ہے جب چمکتی ہوئی تیز دھوپ پڑتی ہے اور زمین کے ہونٹ سوکھ جاتے ہیں۔ جب اس میں ہل چلایا جاتا ہے اور بیج بویا جاتا ہے جب پانی برستا ہے آندھی آتی ہے یا طوفان اٹھتا ہے تو کسان کھیت میں اکیلا ہوتا ہے لیکن جب پودے بڑے ہو جاتے ہیں اور بالیاں پھلنے لگتی ہیں اور کھلیان لگ

جاتے ہیں تو زمیندار، ساہوکار اور نہ جانے کون کہاں کہاں سے آجاتا ہے اور کھیت کی کوکھ اجڑ جاتی ہے اور کھلیانوں کے سینے ویران ہو جاتے ہیں اور بھوکا کسان اور اس کے بلکتے بچے اپنے افلاس میں منہ ڈھانپ کے سو جاتے ہیں اور کسان کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ قومی تحریکِ آزادی کے رہنماؤں نے اس سے وعدہ کیا کہ اگر انگریزوں کو نکال دو تو اس دھرتی پر دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں گی۔ اور کسان نے اس وعدے پر اعتبار کرکے اپنا خون بہا دیا اور چوری چورا سے لے کر ملابار تک زمین کسان کے خون سے رنگین ہوگئی

تلنگانے کا کسان کمیونسٹ پارٹی اور آندھرا مہا سبھا کی رہنمائی میں اٹھا اور اس نے اپنی زمین پر قبضہ کر لیا اور دس لاکھ ایکڑ زمین آپس میں بانٹ لی۔ نظام کی فوج اور رضاکاروں نے مٹھی بھر ظالم دیش مکھوں کی حمایت کے لئے تلنگانے کے کسانوں پر حملہ کر دیا۔ کسان نہتا اور مجبور تھا لیکن اس نے متحد ہو کر اس حملے کی مدافعت کی۔ حملہ آوروں سے ان کے ہتھیار چھین کر اپنی دھرتی اور اپنی بہو بیٹیوں اور اپنی زندگی کے حق کی حفاظت کی۔ حکمران طبقوں نے سارے ملک میں شور مچا دیا کہ تلنگانے میں کمیونسٹ ہتھیار بند لڑائی لڑ رہے ہیں اور تشدد اور دہشت سے کام لے رہے ہیں، زمینداروں کے گھر لوٹ رہے ہیں اور انہیں جان سے مار رہے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی ـــــ کسان مارا جا رہا تھا۔ وہ پہلے بھی مارا جاتا تھا لیکن آج وہ لڑ کر جان دے رہا تھا کیونکہ آج وہ جس دھرتی

کی گود میں تھا وہ اس کی اپنی ہو گئی تھی اور وہ اپنی ماں کی حفاظت کا مقدس فرض انجام دے رہا تھا۔

اتنے میں ۱۹۴۷ء آگیا اور ۱۵ اگست کو یونین جیک اتار کے تلنگانا آزادی آگئی اور کانگریس کا راج ہو گیا جس کا بنیادی اصول اہنسا تھا پھر ہندوستان کی فوجیں حیدرآباد اور تلنگانہ میں داخل ہوئیں کسانوں نے جوش و خروش سے ان کا خیر مقدم کیا یہ ان کی اپنی فوجیں تھیں جو انہیں نظام کی فوج اور رضاکاروں سے بچانے آئی تھیں ـــــ اب انہیں خود اپنی مدافعت نہیں کرنی پڑے گی ہندوستانی فوجیں ان کی مدافعت کریں گی لیکن کانگریس نے نظام شاہی سے سمجھوتہ کر لیا اور تلنگانہ کے محب وطن مجاہدوں اور بہادروں پر ہلہ بول دیا۔

تلنگانہ نے سمجھا تھا کہ آزادی آئے گی لیکن ہندوستانی راج کے ساتھ وہی پرانے دیش مکھ، جاگیردار اور ساہوکار واپس آئے وہی مظالم اور بیگار، وہی بھوک اور افلاس واپس آئے کسانوں کی زمینیں ان سے چھین کر دیش مکھوں اور جاگیرداروں کو واپس کر دی گئیں اور مرکز نے اعلان کیا کہ ہم کاغذ پر جاگیرداری کا خاتمہ کر رہے ہیں اور جو کوئی اس کو تسلیم نہیں کرتا وہ مجرم ہے ـــــ گنڈا ہے ـــــ ڈکیت ہے کمیونسٹ ہے اور تلنگانہ کے مجاہدوں کو جو عوامی جہد آزادی کا ہیرو ہیں گنڈا اور دہشت پسند قرار دے دیا گیا اور غنڈوں اور دہشت پسندوں کا علاج پھانسی کی رسی یا بندوق کی گولی ہے۔ پہلے جب تحصیلدار یا ذیلدار آتا تھا تو اسے دو مرغوں یا دو بکروں کی

ضرورت پڑتی تھی۔ لیکن اب دو کمیونسٹوں اور دو دہشت پسندوں کی ضرورت پڑنے لگی۔ جنگلوں اور کھیتوں اور جیلوں میں کسان مارے جانے لگے اور اخباروں میں خبریں چھپنے لگیں کہ آج دو دہشت پسند مارے گئے اور کل چار کمیونسٹ غنڈے گولی سے ہلاک ہوئے اور اس چیز کا نام جمہوریت اور امنِ عامہ قرار پایا جن کے ہاتھوں میں جدید ترین فوجی ہتھیار تھے وہ امن اور جمہوریت کے محافظ بن گئے اور جن کے پاس زخمی دل اور خون سے بھرے سینے تھے وہ دہشت پسند اور غنڈے قرار دیدیئے گئے اور ہندوستان کے زر خرید پریس نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا کہ کمیونسٹ تہذیب امن اور سماج کے دشمن ہیں۔

کانگریسی دیش بھگتوں نے سمجھا کہ تلنگانہ کچل دیا گیا لیکن کسانوں نے کمیونسٹوں کو الیکشن میں ووٹ دے کر بتا دیا کہ تلنگانہ کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں کچل سکتی کسان بیج کی طرح ہے اگر تم اسے دفن کر دو گے تو وہ فصل بن کے اُگے گا۔ اور ساری زمین پر چھا جائے گا۔

آج معیشت اور سیاست میں زرعی مسئلے نے مرکزی حیثیت اختیار کر رکھی ہے سارے ملک میں قحط اور بیروزگاری کی پرچھائیاں منڈلا رہی ہیں زیادہ غذا پیدا کرنے کیلئے طرح طرح کے منصوبے بنائے ہیں جن پر کروڑوں روپیہ صرف کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ مسئلہ حل ہونے کی بجائے اور الجھتا جاتا ہے کیونکہ مسئلے کی اصل نوعیت یہ ہے کہ کسان کے پاس زمین نہیں ہے پچاس سے پچھتر فیصد تک کسان کھیت مزدور ہیں

جاگیرداری نظامِ معیشت نے ہندوستان کی زرخیز زمین کی وافر پیداوار کے پیروں میں آہنی بیڑیاں ڈال دی ہیں اور جب تک کسان کو زمین نہیں دی جاتی، اس کے قرضے صاف نہیں کئے جاتے۔ لگان میں کمی نہیں کی جاتی اور اسے زراعت کے لئے سرکاری زمین نہیں دی جاتی اس وقت تک غذا، روزگار اور خوش حالی کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

بدحال کسان ~~جو دو وقت پیٹ بھی نہیں بھر سکتا~~ اور جو ملک کی آبادی کی سب سے بڑی اکثریت ہے اگر بدحال رہے گا تو شہر سے سامان نہیں خرید سکتا اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ تو تجارت چل سکتی ہے اور نہ کارخانے ـــــ جب مال بکے گا نہیں تو کارخانے مال تیار کر کے کیا کریں گے ـــــ جب کارخانے مال تیار نہیں کرتے تو چھٹنی ہوتی ہے اور بے روزگاری پھیلتی ہے پھر جرائم بڑھتے ہیں ـــــ بداخلاقی بڑھتی ہے ادب اور تہذیب و تمدن کو نقصان پہنچتا ہے۔ ادیب کی کتابیں نہیں بکتیں وہ بھی بھوکے مرتے ہیں لیکن اس کے برعکس خوشحال کسان شہر کو غلّہ اور غذا دے گا اور اس کے بدلے میں شہر سے مال خریدے گا۔ جس سے تجارت کو فروغ ہوگا۔ کارخانوں کی پیداوار بڑھے گی۔ نئی صنعتیں ترقی کریں گی۔ بیروزگاری ختم ہوگی۔ تعلیم بڑھے گی۔ تہذیب و تمدن کا معیار اونچا ہوگا، ادیبوں کی کتابیں بکیں گی ـــــ ادب اور فن کا فروغ ہوگا اس لئے آج ادیبوں کے ادبی اور فنی مسائل بھی کسانوں کے مسائل سے وابستہ ہو گئے ہیں اور زرعی سوال نے مرکزی حیثیت اختیار کر لی ہے جس کو حل کرنے کی کوشش کے ایک قدم کا نام "تلنگانہ کی جدّوجہد" ہے۔

کرشن نے اس عظیم الشان داستان کے صرف ایک گوشے سے نقاب اٹھائی ہے لیکن اس کی تابناکی آنکھوں کو خیرہ کئے دیتی ہے یہ ایک بائیس سال کے کسان راگھو راؤ کی کہانی نہیں ہے بلکہ تلنگانہ کی عظمت آبرو اور وقار کی کہانی ہے ـــــ یہ ہندوستان کی موجودہ جمہوری تحریک آزادی کے حال و مستقبل کی کہانی ہے۔ کرشن نے اپنے ہیرو کی معصومیت اور پاکیزگی کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

" راگھو راؤ نے اپنے دل کو ٹٹولا ـــــ کیا وہ سچ مچ قاتل تھا ـــــ قتل میں ایک چہرہ ہوتا ہے یا دو چہرے ہوتے ہیں یا بہت سے چہرے ہوتے ہیں جنہیں آدمی یاد رکھتا ہے۔ جن سے آدمی نفرت کرتا ہے ـــــ جن سے آدمی انتقام لینا چاہتا ہے یا جنہیں آدمی مختلف جذبات سے مغلوب ہوکر چاہے وہ نفرت کے جذبات ہوں۔ یا محبت کے ـــــ قتل کر دیتا ہے ـــــ مگر یہاں تو کوئی ایسا چہرہ نہ تھا ـــــ کوئی ایسا جذبہ نہ تھا۔ .... اگر ظلم سے مدافعت کرنا تشدد ہے ـــــ اگر اپنی جان کی حفاظت کرنا ـــــ اپنی ماؤں کی عزت بچانا ـــــ اپنے گاؤں کے کھیتوں کی سنہری بالیوں کی حفاظت کرنا تشدد ہے تو پھر خود جینا بھی تشدد ہے اور سانس لینا بھی تشدد ہے اور دل کا دھڑکنا بھی تشدد ہے

" راگھو راؤ نے آخری بار اپنے دل کو ٹٹولا ـــــ اور آخری بار بھی اُسے کسی ایسے جرم کا چہرہ نظر نہ آیا جس پر اس کی رُوح کو شرمندہ ہونا پڑتا اور جب وہ یہاں تک پہنچا ـــــ تو اس نے اپنی زندگی کے سارے ورق الٹ دیئے

اور کتاب بند کر کے رکھ دی ـــــ اور بڑی خندہ پیشانی سے موت کا چہرہ دیکھنے کے لئے تیار ہو گیا۔"

میں کرشن کو اس ناول پر مبارک باد دیتا ہوں جو اُن کے نئے ادبی سفر کی ابتدا ہے۔

سردار جعفری

بمبئی ۱۲ فروری

راگھو راؤ کی عمر بائیس سال کی تھی ــــ آج جیل میں اُس کی آخری رات تھی ــــ صبح اُسے پھانسی دی جانے والی تھی۔

کال کوٹھڑی میں لیٹے لیٹے راگھو راؤ نے پیچھے مڑ کر دیکھا ــــ اپنی ساری زندگی کی طرف ــــ بڑی احتیاط سے اس نے اپنی مختصر سی زندگی کے ایک ایک لمحے کو گِنا ــــ جیسے کسان اپنی نقدی کو جیب میں رکھنے سے پہلے اسے اچھّی طرح الٹ پلٹ کے دیکھتا ہے ــــ بالکل اسی طرح ــــ اسی احتیاط ــــ اسی توجّہ ــــ اسی شبہے سے راگھو راؤ نے اپنی زندگی کے لمحوں کو الٹ پلٹ کے اچھّی طرح سے دیکھا کیونکہ ان تمام سِکّوں کو اس نے اپنے ہاتھوں سے ڈھالا تھا۔ بیشک کچھ

لمحے اس کے ماں باپ کے تھے ۔ جیسے اس کی پیدائش ، ماں باپ کی لوری ۔ باپ کا کندھا ـــــ کچھ لمحے سماج اور ماحول کی ٹکسال سے ڈھل کر آتے تھے لیکن پھر بھی اس کی زندگی کے بہت سے لمحے ـــــ لمحے جو سب سے اچھے تھے ۔ سب سے عمدہ تھے سب سے قیمتی اور خوبصورت تھے وہ سب اس کے اپنے تھے اور ان کے حسنِ صنعت میں اس کی اپنی مرضی اور محنت کو بڑا دخل تھا ـــــ یعنی جو کچھ وہ تھا جو کچھ اس نے سوچا تھا ـــــ جو کچھ اس نے کیا تھا جس طرح اسے عمل میں لایا تھا ۔ اس کے تواتر میں اس کی اپنی شخصیت کی گہری چھاپ تھی اس پر کسی مافوق الفطرت دیوتا کا سایہ نہ تھا ۔

پھر بھی ہر آدمی کی زندگی میں کچھ سکے کھرے ہوتے ہیں کچھ کھوٹے بھی نکل آتے ہیں اور ان کا محاسبہ ضروری ہے اپنے لئے نہ سہی ، دوسروں کے لئے سہی اور آخر دوسرے بھی تو اپنے ہوتے ہیں اس لئے گو راگھو راؤ کے لئے وقت ختم ہو چکا تھا پھر بھی وہ ایک آخری جائزے کے لئے بڑی محویت کے عالم میں اپنے ماضی کی سمت گھوم گیا ۔ اور اس کے فراخ ماتھے پر سوچ کی گہری لکیریں نمودار ہو گئیں اور گو اس کے پاؤں میں ڈنڈا بیڑی تھی اور اس کے ہاتھ جیل کی دیوار کے اندر دھنسے ہوئے آہنی حلقوں میں جکڑے ہوئے تھے پھر بھی اس کا ذہن اور اس کا تخیل ان تمام جسمانی قیود سے آزاد رہ کر بڑے اطمینان سے بیتے ہوئے لمحوں کا کھرا کھوٹا پرکھنے لگا ۔

کوئی دوسرا اس موقع پر ہوتا تو اسے تضیع اوقات سمجھتا ـــــ مگر راؤ ان لوگوں میں سے نہیں تھا۔ جو وقت کو کائنات کا چوکھٹا ـــــ اور اس لئے وقت کو انسان پر غالب سمجھتے ہیں ـــــ راگھو راؤ نے بڑی کوشش کے بعد اس نکتے کو سمجھا تھا۔ کہ وقت انسان کے ہاتھ میں خام مادّے کی طرح ہے جسے انسان اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے جس میں اپنی محنت شامل کرکے انسان دنیا کو بدل سکتا ہے خود راگھو راؤ نے چھوٹے پیمانے پر ایسا ہی کیا تھا اس میں اسے کہاں تک کامیابی ہوئی ـــــ کہاں تک ناکامیابی ـــــ اسے وہ اس وقت اپنے آخری لمحوں میں پرکھنا چاہتا تھا اس لئے اس نے اپنی زندگی کے سارے سکّے اپنے سامنے پھیلا لئے اور انہیں ایک ایک کرکے اٹھا کے دیکھنے لگا۔

یہ اس کی ماں تھی ـــــ جو اسے تین سال کا بچّہ چھوڑ کے مرگئی اس کی بہت ہی دھندلی سی یاد اس کے دل میں رہ گئی تھی ـــــ وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پستانوں کا کچّا دودھ اس کے ہونٹوں تک پھیلتا ہوا ـــــ ایک نرم اور گرم آغوش اور اس کا ماں کے سینے پر ہاتھ رکھ کے سو جانا ـــــ بس اتنی سی یاد تھی ـــــ راگھو راؤ نے اس سکّے کو بڑی محبّت سے چوما ـــــ اور اسے ایک طرف رکھ دیا۔

یہ اس کا باپ تھا ـــــ ویرپّا ـــــ

ویرپّا جو اس کی ماں بھی اور باپ بھی تھا۔ دوست بھی تھا ـــــ اور ساتھی بھی تھا ـــــ اس کے ساتھ شانہ بشانہ لڑنے والا بھی تھا ـــــ اور گورو بھی تھا

بہت سی شخصیتیں ویریا میں آکے اکٹھی ہو گئی تھیں ـــــ اچھا ہوتا اگر راگھوراؤ کو
یہ سب شخصیتیں الگ الگ ملتیں۔ ان سے زندگی زیادہ دلچسپ گہری اور خوبصورت
ہو جاتی مگر کچھ سکے سماج اور ماحول کے بھی ہوتے ہیں جو لامحالہ زندگی کی مٹھی میں
ڈال دیئے جاتے ہیں اور انسان کو انہیں اپنے ساتھ لے کر اپنی قسمت کو بدلنا پڑتا
ہے یعنی یہ بات کہ ویریا ایک کھیت مزدور تھا ـــــ وہ وِڈّی تھا ـــــ وہ بے
گار پر جاتا تھا اور بچے کو اکیلے گھر چھوڑ جایا کرتا ـــــ وہ مجبور تھا اور اکثر وہ
ایسا ہی کرتا رہتا ـــــ حتیٰ کہ بچے نے رو رو کر خاموش ہو جانا سیکھ لیا دودھ کی
جگہ انم اور گونگ گورا کے پتوں کی چٹنی کھانا سیکھ لیا ـــــ خود اپنے ہاتھوں سے
روٹی پکانا سیکھ لیا ایک لمبے عرصہ کیلئے جب تک اسے کھیتوں میں کام کرنا نہیں
آیا وہ اپنے باپ کے لئے خود روٹی پکا کر کھیتوں میں لے جاتا رہا ـــــ یہ بہت
مشکل نہ تھا پہلے تو وہ باجرے کو چاولوں کی طرح پانی میں اُبال لیتا۔ پھر تھوڑی
سی چٹنی پیس لیتا پھر وہ دونوں کو کیلے کے پتے میں لپیٹ کر کھیتوں میں اپنے
باپ کے پاس لے جاتا جہاں کبھی کبھی زمیندار کے گھر سے لسی آجاتی اور چٹنی کے
ساتھ انم کھا کے تھکے ہوئے بازوؤں میں قوت آجاتی تھی اور ویریا کھیتوں سے
فصل کاٹنے لگتا ـــــ اور راگھوراؤ کاٹی ہوئی فصل کو اکٹھا کرنے لگتا۔ پھر وہ
دن بھی آگیا جب راگھوراؤ نے بیج بونا ـــــ فصل کاٹنا اور دونوں سے محروم
رہنا سیکھ لیا ـــــ اب وہ پورا کھیت مزدور بن گیا اور اس کی تعلیم مکمل ہو گئی

اور اس کے وٹّی باپ نے بڑے فخر سے اپنے وٹّی بیٹے کی طرف دیکھا۔ جیسے
بوجھ ڈھونے والا گدھا بڑے پیار سے اپنے بوجھ ڈھونے والے گدھے بیٹے کی
طرف دیکھتا ہے باپ کا پیار اسی میں ہے کہ بیٹے کا بوجھ ذرا کم کر دے اور بیٹے
کا پیار اس میں ہے کہ وہ باپ کے بوجھ کو اپنے اوپر لے لے۔ اور زمیندار کا
دھندا اس میں ہے کہ وہ دونوں پر آہستہ آہستہ بوجھ بڑھاتا جائے۔

راگھوراؤ نے اس سکے کو الٹ پلٹ کے پھر دیکھا ـــــ کتنی ہی باتیں اس میں اور اس کے باپ میں مشترک تھیں۔ باپ کا قد ـــــ باپ کا رنگ۔ باپ کی غریبی ـــــ وہ قد اور رنگ کو تو نہ بدل سکتا تھا نہ ان باتوں کی اس میں کوئی خواہش تھی۔ لیکن اپنی غریبی کو اس نے ضرور بدلنا چاہا تھا اور یہ خواہش کوئی نوجوانی کے عالم میں نہیں بہت پہلے بچپن کے دنوں میں پیدا ہوئی تھی جب اس نے کچھ بچوں کو اسکول جاتے ہوئے دیکھا تھا کتابیں اور بستے اور اُجلے کپڑے، ان چیزوں کو حاصل کرنے ـــــ انہیں چھونے ـــــ انہیں پیار کرنے کا شدید ترین جذبہ اس کے دل میں ابھر آیا ـــــ مگر دیر تیا نے جلد ہی اپنے کو سمجھ لیا کہ ایسا ہونا

ناممکن ہے وڈّی کا لڑکا وڈّی ہوتا ہے جیسے زمیندار کا لڑکا زمیندار ہوتا ہے اور نمبردار کا لڑکا نمبردار ہوتا ہے اور پروہت کا لڑکا پروہت ہوتا ہے اس طرح سے کچھ لڑکے اسکول جاتے ہیں اور کچھ لڑکے کھیتوں میں فصل کاٹتے ہیں اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے ہزاروں سال سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے اور ہزاروں سال بھی ایسا ہوتا رہے گا۔

راگھوراؤ چپ ہوگیا ——— اور باپ نے سمجھا کہ بیٹے نے باپ کی طرح سے ہار مان لی ——— مگر کیا درحقیقت ایسا ہی ہوا۔؟

یہاں راگھوراؤ نے اپنی زندگی کا ایک اور لمحہ اٹھالیا جب وہ گیارہ سال کا تھا تو اس کے گاؤں سری پورم میں بڑا میلہ لگا۔ یہ میلہ ہر دس سال کے بعد اس کے گاؤں میں آتا تھا ——— سری پورم کے تاڑ کے پتوں سے چھتے ہوئے گاؤں میں خوشیوں کی لہریں اڑنے لگیں ——— ویریّا نے پہلی بار اپنے بیٹے کو بالکل نئے کپڑے پہنائے ——— گاڑھے کی دھوتی ——— گاڑھے کا کرتہ اور سر پر گاڑھے کی پگڑی اور گلے میں کالا دھاگہ اور ایک جنتر منتر کا منکا جو اس کو کسی سادھو نے دیا تھا اس روز راگھوراؤ بھوگاوتی ندی میں نہاکر اور اُجلے کپڑے پہن کر بہت خوش ہوا ——— پھر وہ بہت جلد انم اور ٹپوا کھاکے اپنے باپ کے ہمراہ گاؤں کے بیچ کھلی سمت کی طرف چلا گیا جہاں میلہ لگا تھا۔ راستے میں درختوں کے نیچے لڑکے بلنگ گوڑی اور چھڈو گڈو کھیل رہے تھے۔

ایک بڑے بوڑھے برگد کے نیچے لڑکیاں لاؤٹ کھیل رہی تھیں آگے جا کے رتن بنڈے کی سنگلاخ اونچی پتھریلی جگہ شروع ہو گئی ـــــ جہاں میلہ لگا تھا۔ میلے میں بنجارے رمبو قسم کے برتن لے کر آئے تھے چوڑیاں کنگھیاں اور تیل لے کے آئے تھے تمباکو اور گڑ لے کے آئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے مٹی کے کھلونے تاڑ کے بورے اور جھبے لے کے آئے تھے ایک طرف جاپانی ریشم کے کپڑوں کی دوکان تھی جس میں راگھو راؤ بڑی دیر تک کھڑا رہا ـــــ کیا کپڑے اتنے خوب صورت ہو سکتے ہیں ـــــ اتنے دلکش اور نرم ـــــ

اسے یاد ہے کہ اس نے آگے بڑھ کے ریشم کے ایک تھان کو اپنے ہاتھ سے چھو لیا تھا ـــــ کیا یہ سچ ہے کہ کپڑے انسان کے خوابوں کی طرح اتنے نرم گداز اور روپہلے ہو سکتے ہیں اس لئے اس نے ایک لمحہ کے لئے انہیں چھو کر دیکھ لیا اور اس کا وہ برسوں پرانا لمس آج بھی اس وقت اس کال کوٹھڑی میں ایک روپہلے سکے کی طرح چھن سے بول اٹھا ـــــ بہت دیر تک راگھو راؤ اس لمحے کی گونج سے محظوظ ہوتا رہا اور اپنے دل میں اس کی آواز سنتا رہا اور اپنے ہاتھ اس سکے پر پھیرتا رہا

اور پھر اسے یاد آیا کہ دوکان کے بزاز میا سیٹھ نے اسے جھڑک دیا تھا۔

"ڈھیٹ ہو کر ریشم کو ہاتھ لگاتا ہے کمبخت ـــــ کھڑے کھڑے کھال کھنچوا دوں گا ـــــ" عین اس وقت اس کے باپ ویریا نے اپنے بیٹے کا ہاتھ ریشم کے تھان سے کھینچ لیا اور اپنے بیٹے کو لے کے آگے چلا گیا اور راگھو راؤ کو محسوس ہوا

نہ صرف زندگی کی عریانی اس کے لئے ہے۔ زندگی کا ریشم اس ملائمیت نرمی، گدانہ اس کے لئے نہیں ہے اور راگھو راؤ نے پھر اپنی ہتھیلی پر ایک کھوٹے سکے کو دیکھا جسے وہ اپنی تمناؤں کے بازار میں کسی طرح نہ بیچ سکتا تھا ـــــ نہ الٹ کر ـــــ نہ پلٹ کر۔ یہ سکہ جو نہ اس کا اپنا تھا ـــــ نہ اس کے باپ کا۔ نہ ان دونوں کی محنت کا ـــــ بلکہ سماج کی مہر تھا۔ یکایک راگھو راؤ کا دل بے حد اداس ہو گیا باپ کے سمجھانے پر بھی نہیں بہلا جب باپ نے اسے جوہے پر چڑھایا اور بعد میں اسے گڑ کا شربت پلایا تو اس کا جی کچھ بہلا لیکن پھر بھی دیر تک اس کا دل ریشم کے رنگین کپڑے کیلئے مچلتا رہ گیا۔

○

۴۲

شام کے وقت جب باپ اور بیٹا میلے سے باہر نکلے تو انہیں پٹیل کے کارندے بھیمیا اور درگیا مل گئے دونوں کی آنکھیں شراب سے سرخ تھیں ــــ دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے انہوں نے باپ بیٹے کو دیکھتے ہی گھیر لیا۔

ویریا نے پوچھا

"خیریت تو ہے ــــ"

درگیا بولا

"سیدھے سیدھے چلے چلو گے تو خیریت ہی خیریت ہے ــــ"

"کہاں جانا ہو گا ــــ"

ویریا نے پوچھا

"نئی کے لئے سو یہ پیٹ ـــ ابھی اسی وقت زمیندار نے بلایا ہے۔"

"مگر آج تو میلہ ہے ـــ" راگھو راؤ نے چمک کے کہا

بھییا نے راگھو راؤ کو گریبان سے پکڑ لیا اس کے رخساروں پر دو طمانچے لگائے اس کی پگڑی اتار کے دھول میں پھینک دی اور اس کے نئے کرتے کو دونوں ہاتھوں سے چیر دیا اور اس کی دھوتی کھول کے اسے ننگا کر دیا ـــ اور اسے لات مار کے زمین پر گرا دیا۔

راگھو راؤ نے اٹھنے کی کوشش کی مگر بھییا بہت تگڑا ـــ اور وہ ابھی بچہ تھا ـــ اس لئے جب درگیا نے اس کے سینے پر پستول رکھ دیا تو ویریا نے بھاگ کے درگیا کے ہاتھ پکڑ لئے اور گڑگڑا کے بولا

"مالک یہ تو بچہ ہے اسے کیا معلوم کہ ہم تو وٹی ہیں ـــ سرکار کے غلام ہیں بھیرے میلے میں بھی زمیندار بلائے گا تو جائیں گے ـــ"

"کیوں جائیں گے ـــ" راگھو راؤ غصہ سے بولا

"چپ رہ ـــ" ویریا نے اپنے بیٹے کو ایک گھونسہ دیا ـــ راگھو راؤ کے ہونٹوں سے خون نکلنے لگا ـــ ویریا نے آج تک اپنے بیٹے کو کبھی مارا نہ تھا اس لئے راگھو راؤ حیرت سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا اس نے بہتے ہوئے لہو کو پونچھنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ ہاں جب لہو ٹھوڑی سے نیچے بہہ چلا تو اس نے اسی طرح باپ کی طرف حیرت سے تکتے تکتے اپنے ہاتھ سے اپنا لہو

پونچھ لیا اور اس کے بعد جو خون بہا اسے چپکے سے پی گیا ـــــ کچھ تھوک دیا ـــ
مگر بولا نہیں ـــــ

ویریّا نے اپنے بیٹے کو گالی دے کر کہا۔

" چلیئے مالک ـــــ میں دِتّی ہوں ـــــ میں مالک کی بیگار بجالاؤں گا ـــ میرا بیٹا بھی دِتّی ہے ـــ وہ بھی چلے گا۔ بھلا ہم دِتّی لوگوں کے لئے میلہ ٹھیلہ کیا معنی ـــــ ؟"

" اب سیدھا ہوا ہے جا کے کہیں ـــــ سالا نئے کپڑے پہن کے سامنے آتا ہے"

درگیّا راگھوراؤ کو ایک دھکا دے کر آگے چلانے لگا ـــــ

ویریّا نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

" بڑی خطا ہوئی مالک میں تو منع کر رہا تھا مگر یہ کمبخت نہ مانا کہنے لگا۔ آج میلہ ہے آج نئے کپڑے پہنوں گا ـــــ "

" تو جانتا نہیں ہے مالکوں کے سامنے کوئی نئے کپڑے نہیں پہن سکتا ہے "

" جانتا ہوں ـــــ "

" پھر ـــــ ؟ "

" مالک معافی دے دو آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی ـــــ "

بھیمیّا نے کہا

" اسی لئے میں نے اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے ہیں آئندہ یہ ایسی غلطی نہیں کرے

گا ـــ وٹّی کو وٹّی کی طرح رہنا چاہیئے ـــ "

"ٹھیک کہتے ہو مالک ـــ "

بھیّیا اور درگیّا نے میلہ اور گاؤں سے پچاس ساٹھ وٹّی جمع کیے اور انہیں ریوڑ کی طرح ہانک کے زمیندار کی ڈیوڑھی پر لے گئے۔

زمیندار کی بنگلو بہت اونچی تھی ـــ اس کا دروازہ بہت بلند اور جدید تھا اور بنگلو کے اندر زمیندار کا گھر تھا جو آج تک کسی وٹّی نے نہ دیکھا تھا۔ راگھو راؤ کے لئے بنگلو پر جانے کا یہ پہلا موقعہ تھا ـــ بنگلو کو اس نے دور سے دیکھا تھا۔ ایک دو دفعہ ہمت کر کے وہ اس کے قریب سے بھی گزرا تھا جہاں سنتری پہرہ دیتے تھے مگر بنگلو کے اندر قدم رکھنے کی جرأت اسے کبھی نہ ہوئی تھی۔

بچے کے اندر تجسس اور تلاش اور دریافت کا جو مادّہ ہوتا ہے وہ راگھو راؤ کے اندر بھی تھا۔ اس لئے آج مار کھانے کے باوجود کپڑے پھٹ جانے کے باوجود۔ زمیندار اور زمیندار کی عالیشان بنگلو کے باوجود، وہ بڑی دلچسپی سے بنگلو کے ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ اس کے باپ نے اس کی گردن ناپی اور زور سے اس کی گردن کو فرش کی جانب جھکا کے کہا۔

"اوپر نہ دیکھ ـــ نیچے قدموں میں دیکھ نہیں تو مالک خفا ہوں گے۔"

اس وقت راگھو راؤ نے ایک پلک جھپکنے میں دیکھ لیا کہ سارے وٹّی مؤدب قطار اندر قطار کھڑے ہیں سر جھکائے ہوئے ہاتھ جوڑے ہوئے ـــ قدموں میں

نگاہیں گڑائے ہوئے۔

پھر راگھو راؤ کے کانوں میں ایک کرخت آواز آئی —— " درگیا —— "

" جی مالک —— " درگیا بولا —— مگر راگھو راؤ خوف سے اوپر نہیں دیکھ سکا

" کتنے وتی لائے ہو —— "

" دو کم ساٹھ لایا ہوں مالک ! "

" اچھا —— کام چل جائے گا مگر کھانے کا بندوبست بھی کرے —— ان کو بہت دور جانا ہے —— "

بھیمیا بولا " یہ لوگ کھانا ساتھ لائے ہیں مالک —— " اور ویریا نے دل میں سوچا —— یہ تو بالکل جھوٹ ہے —— "

" اچھا —— اچھا —— تو چلو —— تیاری کرو —— " پھر وہی کرخت آواز سنائی دی۔

پھر بھیمیا اور درگیا سارے ویٹوں کو الٹے قدموں بنگو سے باہر لائے اور اُن پر سامان لادنے لگے۔ بہت سا سامان تھا کیونکہ سوریہ پیٹ میں زمیندار کے لڑکے کی سگائی تھی اس لئے سامان بہت تھا — اور چار تو پالکیاں تھیں — ایک جگن ناتھ ریڈی زمیندار کے لئے — جو سری پورم، پتی پاڈو اور آس پاس کے چالیس گاؤں کا بلا شرکت غیرے مالک تھا۔

دوسری پالکی جگن ناتھ ریڈی کے لڑکے پرتاپ ریڈی کی تھی جس کی سوریہ پیٹ میں منگنی تھی — تیسری پالکی پرتاپ ریڈی کی ماں کی تھی — جس کا اس موقعہ پر سوریہ پیٹ جانا بہت ضروری تھا —

پہلی دو پالکیاں کھلی تھیں ـــــ لیکن تیسری پالکی بند تھی ـــــ چوتھی پالکی بھی بند تھی ـــــ لیکن یہ چوتھی پالکی بالکل نئی رنگین اور منقش تھی اور اس کے دو طرف لال لال ریشم کے کاڑھے ہوئے پردے کھنچے تھے جو ذرا سے ہوا کے جھونکے پر لہرا اٹھتے تھے اور ان کے سروں پر بندھی ہوئی کانچ کی لڑیاں یوں جھنجھناتی تھیں جیسے لاؤڈ کھیلتے وقت بہت سی لڑکیاں ایک دم ہنس دیں۔

راگھوراؤ نے بڑی حیرت اور دلچسپی سے اس بند کی طرف دیکھا اور اپنے باپ سے اس کے متعلق دریافت بھی کیا لیکن اپنے باپ سے بھی اُسے اپنے سوال کے جواب میں ایک گھونسہ سے زیادہ کچھ نہ ملا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کے شور وغل کے بعد زمیندار کا قافلہ بنکوٹ سے چلا آٹھ وٹی ہر پالکی کے ساتھ تھے ـــــ پہلی پالکی مالک کی ـــــ دوسری پالکی مالک کے بیٹے کی ـــــ تیسری پالکی مالک کی بیوی کی ـــــ چوتھی پالکی خالی تھی ـــــ راگھوراؤ کو پتہ نہ چل سکا ـــــ کیوں ـــــ ؟

ویریا کی ڈیوٹی مالک کی پالکی اٹھانے پر تھی راگھوراؤ کو ایک بڑا آئینہ ہی اٹھانے کو ملا جس میں وہ بار بار اپنا چہرہ دیکھتا تھا اور خوش ہوتا تھا لیکن آئینہ اٹھانے پر بھی وہ چوتھی پالکی کے قریب چلتا رہا ـــــ اس پالکی کے اٹھانے والوں میں رنگڈو وٹی بھی تھا جو اس کے باپ کا دوست تھا اس لئے راگھوراؤ اس کے قریب قریب چلتا رہا ـــــ اور جب اس نے دیکھا کہ تیسری پالکی اور چوتھی پالکی میں

فاصلہ کچھ بڑھ گیا ہے تو اس نے ادھر ادھر دیکھ کے رنگڈو سے آہستہ سے دریافت کیا۔

"چاچا ——— یہ خالی پالکی کس کی ہے ——؟"

"مجھے کیا معلوم ——؟"

رنگڈو نے خفا ہو کے جواب دیا۔

"بتا دو چاچا ——"

راؤ نے بڑی لجاجت سے پوچھا

رنگڈو آج بہت خفا تھا۔ کیونکہ زمیندار کے کارندے اسے میلہ سے اٹھا لائے تھے اس لئے آج رنگڈو کا مزاج بہت برہم تھا ——— سال کے سارے دن مالک کے ہوتے ہیں لیکن میلہ کا دن وٹی کا ہوتا ہے اس لئے آج رنگڈو کسی بات کا ٹھیک طرح سے جواب نہ دینا چاہتا تھا۔ لیکن لڑکے کی دلچسپی اور معصومیت دیکھ کر اس کا دل بھی پسیج گیا۔

رنگڈو نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا

"اس میں زمیندار کی ماں کی بہن (گالی دے کر) آئے گی۔"

"کون ——؟"

راؤ کچھ نہ سمجھا

"اس کے بیٹے کی (گالی دے کر) ماں کی (گالی دے کر) وہ (گالی دے کر)

آئے گی ——"

راؤ پھر بھی کچھ نہ سمجھا وہ حیرت سے رنگڈو کی طرف دیکھنے لگا۔

رنگڈو نے زمین کی طرف تھوک دیا اس میں —— آج سے ایک سال بعد —— جب مالک کے بیٹے کی شادی ہوگی تو مالک کی دلہن سور یہ پیٹ سے سری پورم لائی جائے گی اس وقت بھی تجھے اور مجھے ہی چاکری کے لئے جانا ہوگا۔

زمیندار کے ایک کارندے نے آکے رنگڈو کو زور سے ٹھوکا دیا۔

"باتیں ہی کرے گا یا آگے بھی چلے گا —— دیکھتا نہیں ہے تیسری پالکی کتنی آگے نکل گئی ہے۔"

رنگڈو اور دوسرے وڈّی پالکی کو اٹھائے خچّروں کی طرح بگٹٹ بھاگے راگھو راؤ بھی آئینہ اٹھائے تیزی سے بھاگا۔

سری پورم سے سوریہ پیٹ کا سفر بہت تکلیف دہ تھا لیکن راگھو راؤ کو دو باتیں اس سفر کی کبھی نہیں بھولیں گی۔ ایک تو جب اس نے گاؤں سے دور جا کے۔ ایک پہاڑی رستے پر چڑھ کے چوٹی کے ناکے سے مڑ کے۔ اپنے گاؤں کی طرف دیکھا تھا، اپنے آئینہ میں اس کا گاؤں چمک رہا تھا ـــــ روئی کے پھیلے ہوئے کھیت۔ روئی جو آندھرا کی برف ہے ـــــ

تاڑ کے پتوں سے چھتے ہوئے گھر، گھروں کے بیچ میں سیاہ چٹانوں کا رقص بنڈا جہاں ابھی تک لوگ جھولا جھول رہے تھے اور رقص بنڈ سے پرے دے یا اور چنتا کے پیڑوں کے جھنڈ کے جھنڈ جہاں شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں پرندے بسیرا کرنے کیلئے جا رہے تھے۔

راگھوراؤ کو اپنی تمام صعوبتوں، تمام تکلیفوں، تمام دکھوں کے باوجود اپنا گھر، اپنا گاؤں، اپنا تالاب بہت بھلا معلوم ہوا آج تک اس نے اپنے گھر اور گاؤں کو اتنی دور سے کبھی نہ دیکھا تھا اس لئے زندگی کا وہ حسن جو دوری پیدا کر دیتی ہے اس کے دل کے آئینہ میں چکا چوندسی پیدا کر گیا۔

اس گاؤں اور گھر اور زمین کی خوبصورتی کی تو بھی یاد کبھی راگھوراؤ کے دل سے محو نہ ہو سکی، آج بھی کال کوٹھڑی کی چار دیواری میں آنکھیں بند کئے وہ اس خوبصورتی کو دیکھ سکتا تھا —— اور چھو سکتا تھا۔ اسے اس خوبصورتی کے پرکھنے کا، چھونے کا، چکھنے کا، جلا دینے کا حق تھا —— کیونکہ وہ زندگی بھر اس سے لڑا تھا۔

دوسری بات جو اسے سفر کی یاد آ رہی تھی وہ اس کے گاؤں سے متعلق نہ تھی وہ بات اس رات کو سوریہ پیٹ میں ایک بڑے اصطبل کے احاطے میں اس نے محسوس کی —— اس اصطبل میں گاؤں کے پٹواری شری راما پنتلو اور گاؤں کے پروہت شری شیارام شاستری اور گاؤں کے پولیس پٹیل شری لکشمی کانت راؤ اور دوسرے معزز مہمانوں کے گھوڑے رکھے ہوئے تھے یہیں گاؤں کے ڈیٹوں کو جائے پناہ ملی تھی۔ مگر جو بات اس نے یاد رکھی جو اس کے دل میں اتر گئی —— وہ نہ گھوڑوں کی لید تھی —— نہ احاطے کی گندگی

تھی۔ نہ ننگے فرش کی ٹھنڈک اور سختی تھی ـــــ بلکہ وہ بُرا لکھا تھی ـــ جو اس نے اس رات اصطبل کے احاطے میں پتی پاڈو کے کتھا کاروں سے سنی یہ کتھا کار بھی جگن ناتھ ریڈی کی ملکیت تھے اور یہاں پر منگنی کے شبھ اوسر پر بلائے گئے تھے۔

یہ تین آدمی تھے ـــــ

ایک سفید داڑھی والا دیا لکھتا تھا ـــــ جس کا چہرہ دیئے کی روشنی میں آندھرا کی لال دھرتی کی طرح چمکتا تھا ـــــ اس کے چہرے پر اتنی ہی جھریاں تھیں جتنے آندھرا کے سینے پر درد کے گھاؤ تھے ایک ہاتھ میں ایک تارا تھا ـــــ ایک بہت بڑی پگڑی پہنے ہوئے نوجوان مسخرہ تھا جس کے چہرے پر زندگی کی تابانی یوں جھلکتی تھی جیسے شہد سے بھرے چھتے میں شہد جھلکتا ہے ـــــ زندگی جو ہارنا نہیں جانتی ـــــ یہ مسخرہ ہاسیہ کار کہلاتا تھا اور کتھا کے بیچ میں بول کر اُلٹے سیدھے سوالات دریافت کرکے لوگوں کو ہنساتا تھا ـــــ تیسرے کتھا کار کے ہاتھ میں بُرا تھا، جو مردنگ کی طرح بجتا تھا ـــــ

جب رات گہری ہوگئی اور چاروں طرف سناٹا چھا گیا اور گھوڑوں نے خشک باجرے اور دیوتوں نے اُبلے ہوئے باجرے سے اپنا پیٹ بھر لیا تو کتھا کاروں نے گھوڑوں کے پانی پینے والے تالاب کے کنارے

دیئے جلائے اور اُن کی روشنی میں اپنی کتھا شروع کی۔

کتھا کار نے مردنگ بجا کے کہا

"آج سے بہت پہلے ——

ہاسیہ کار نے لقمہ دیا۔

"جب جگن ناتھ ریڈی کا وجود نہ تھا۔"

کتھا کار نے مردنگ بجا کے کہا

"بہت بہت پہلے ——

ہاسیہ کار نے کہا۔

"جب وَڈّی لوگ سفید چاول کھاتے تھے۔ اور سفید ریشم پہنتے تھے۔

کتھا کار بولا —— آج سے کئی سو سال پہلے جب ورنگل میں کاکتیہ سلطنت تھی —— اور اُدرما دیوی کا راج تھا اس سمے بلیمیم پلّی کے گاؤں کے قریب ایک جوگی رہتا تھا.......

کتھا شروع ہو گئی —— مردنگ اور یکتارہ اور ہاسیہ کار کے چٹکلے اور راگھو راؤ بہت دور وشال آندھرا کی پرانی عظیم الشان دھرتی پر پہنچ گیا —— وڈّی لوگ اپنا سارا سکھ دکھ بھول کر کہانی میں کھو گئے۔

کہانی میں ایک خوبصورت جوگی تھا —— ایک خوبصورت راجکماری تھی —— راجکماری کا باپ وشنومت کا پجاری تھا —— جوگی شوجی کی

پوجا کرتا تھا ـــــ جو گی سنسار میں ظلم کا خاتمہ کرنے آیا تھا اور نئے دھرم کو اجاگر کرنے چلا تھا۔ کہ راستے میں اسے راجکماری مل گئی۔

دیر تک فضا میں ایکتارے کے سُر تھر تھراتے رہے ـــ دیر تک راجکماری کی سورت دِیئوں کی پھیلی ہوئی پتلیوں میں ڈولتی رہی ـــ دیر تک دیئوں کی لَو تالاب کے پانی میں جھلملاتی رہیں دیر تک تارے آسمان پر پلک جھپکتے رہے اور راگھو راؤ کو معلوم تک نہ ہوا کہ وہ کب تک جاگتا رہا۔ کب سویا ـــ اسے صرف اس وقت معلوم ہوا کہ دوسرا دن چڑھ آیا ہے اور رات کا سپنا ٹوٹ گیا ہے۔ جب سورج کی پہلی کرن نے اس کی آنکھوں کو جگانے کے لئے گدگدایا ـــ راگھو راؤ ہڑ بڑا کر جلدی سے اٹھ بیٹھا اس نے دیکھا اس کا باپ ابھی تک سو رہا ہے اور اصطبل میں گھوڑے ہنہنا رہے ہیں اور فرش پر بار بار تنک مزاجی سے اپنے سُم بجا رہے ہیں۔

اِس کے بعد راگھو راؤ کا ذہن بہت دیر تک خالی رہا۔۔۔ کہیں کہیں زندگی کے دھیمے سُر۔۔۔ چھوٹی چھوٹی نفرتیں چھوٹے چھوٹے بلبلوں کی طرح اس کے ذہن میں پھوٹتی رہیں۔ مگر اس نے ان کی طرف دھیان نہیں دیا۔۔۔ ان نفرتوں میں جگن ناتھ ریڈی پرتاپ ریڈی، پولیس پٹیل اور گاؤں کے دوسرے مالکوں کی صورتیں بار بار سامنے آکے گم ہو جاتی تھیں۔ ان نفرتوں کی طرف اس نے اس وقت زیادہ دھیان نہیں دیا۔۔۔

گو وہ جانتا تھا کہ اس کے دل کے اندر جو گل بوٹے اُگے ہیں ان کیلئے اس کی سرزمین میں انہیں نفرتوں کی کھاد ڈالی گئی ہے مگر وہ نفرت برائے نفرت کا پجاری نہ تھا۔ اس لئے بہت سے لمحوں کو آگے پھلانگ کے بڑھ گیا

بہت سے ملکوں کو اس نے صرف ہاتھ لگا کے چھوڑ دیا اور لڑکپن سے جوانی میں بھاگ آیا۔ یہاں پہ اسے اپنا دوست ناگیشور یاد آیا جو اس کے قریب ہی کسی دوسری کال کوٹھڑی میں بند تھا۔

ناگیشور راگھو راؤ کی طرح میانہ قد نہ رکھتا تھا بلکہ چھ فٹ سے اوپر نکلتا ہوا تھا ــــــ جتنا اس کا قد اونچا تھا اتنی اس کی لاٹھی اونچی تھی اور اتنا اس کا قہقہہ اونچا تھا ــــــ ناگیشور بھوگاوتی ندی کے اس پار جنگل میں گائیں بھینسیں چراتا تھا۔ گیت گاتا تھا اور جب کبھی راگھو راؤ کو وٹی کے کام سے بھاگنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو ناگیشور اسے اپنے ہاں پناہ بھی دیتا تھا ناگیشور اور راگھو راؤ کی دوستی محبت سے نہیں نفرت سے شروع ہوتی تھی۔

ناگیشور کو زمیندار سے اس لئے نفرت تھی کہ وہ سال میں دو چار بار کوئی پیسہ دیئے بغیر اس سے بھیڑ بکریاں طلب کر لیتا تھا۔

اور راگھو راؤ کو زمیندار سے اس لئے نفرت تھی کہ وہ وٹی تھا اس کا باپ وٹی تھا ــ لیکن دیریا نے اسے بتایا تھا کہ کبھی وہ لوگ زمیندار کے وٹی نہ تھے۔ کبھی ان کے پاس بھی زمین تھی ـــ ہل تھا۔ بیل تھے۔ روئی کے گالے تھے۔ اناج کی سنہری بالیاں تھیں۔ آنگن میں ہنستے ہوئے بچے اور گیت گاتی ہوئی بہو دیں تھیں۔ اور پھر دیریا نے بڑی ہی نفرت اور حسرت کے درمیان یہ کہا تھا۔

"وہ سامنے زمیندار کی عالیشان بنگو دیکھتے ہو ـــــ میرے بیٹے راگھو۔ اس بنگلے نے ہمارا سب کچھ چرا لیا ہے ـــــ ہمیں آدمی سے جانور بنا دیا ہے۔ میرے بیٹے یہ اونچی بنگو ہمارے خاندان کی دشمن ہے ـــ میرے بیٹے ـــــ میرے باپ نے مجھے یہ نفرت سونپی تھی ـــــ آج تو بڑا ہو گیا ہے آج میں یہ نفرت تجھے سونپتا ہوں۔ لوگ اپنے بیٹے کو جائیداد دیتے ہیں ـــــ گھر دیتے ہیں، بہو دیتے ہیں ـــــ زمین دیتے ہیں ـــــ میرے پاس کوئی زمین نہیں ہے۔ صرف یہ نفرت ہے جسے میں تجھے سونپتا ہوں ـــــ میں بوجھ اٹھاتے اٹھاتے بڈھا ہو چکا۔ میرے پاس طاقت نہیں ہے۔ طاقت کا راستہ بھی نہیں ہے صرف یہ نفرت ہے جسے میں تیرے حوالے کرتا ہوں ـــــ اگر تو کوئی رستہ ڈھونڈ سکتا ہے تو ڈھونڈ لے۔

اس دن سے راگھو راؤ نے اس مقدس نفرت کو ایک پاکیزہ وراثت کی طرح اٹھا کر اپنے دل میں رکھ لیا تھا ـــــ اپنی زندگی کے تجربے سے اس نے اس میں اضافہ کیا تھا ـــــ

روزمرہ کی زندگی نے اسے بتایا تھا کہ زمیندار کی بنگو صرف اس کے خاندان ہی کی دشمن نہیں ہے بلکہ راملو ـــــ رنگڈو ـــــ سوم آپا ـــــ دنیکٹ راؤ اور دوسرے سینکڑوں ریڈیوں کے خاندانوں کی دشمن ہے جن کی سنہری بالیاں کھیت گیت، گھر، روٹی کے پھول اور بہوؤں کی ہنسی اس بنگو نے چرالی تھیں یہی نفرت ناگیشور اور راگھو راؤ کی دوستی کی بنیاد بنی ـــــ اسی نفرت نے

راگھو راؤ کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ دنیا میں پرتاپ ریڈی تو بہت کم ہیں اور دتّو بہت زیادہ ہیں اور یہ اگر دتّو لوگ آپس میں ایکا کریں تو اس بنکو کی دیواریں زیادہ دیر تک کھڑی نہیں رہ سکتیں

یہ سوچ اس کے دل میں کوئی یک دم واضح قاطع شکل میں نہیں آتی تھی ـــــ بہت آہستہ دھیرے دھیرے موہوم صورت میں ـــــ دھندلائے ہوئے رستوں سے چل کر یہ حقیقت اس کے پاس آئی تھی لیکن جس چیز نے اس نفرت کو ایک شدید جذبے کی صورت دی وہ زمیندار سے نفرت نہیں تھی۔ زندگی سے محبت تھی۔

پھر آہستہ سے راگھو راؤ نے اپنی زندگی کی مٹھی کھولی اور نفرت کے بہت سے جلتے ہوئے لمحوں کے درمیان محبت کے ایک چمکتے ہوئے پھول کو دیکھا اور چہرہ ایک دم روشن ہو گیا۔

چندری ـــــ

راگھو راؤ کو تین سال پہلے کا ایک کھیت یاد آیا ـــــ کھیت روئی کے پھولوں سے برف بار تھے ـــــ وہ صبح سے روئی کے پھول چن رہا تھا ـــــ کہیں کہیں سفید روئی کے پھولوں میں بھوری روئی کے پھول بھی آجاتے تو انہیں وہ الگ جھولے میں رکھ دیتا ـــــ کہیں کہیں سفید روئی کے پھولوں میں نرمے کی بڑھیا پھول آجاتے تو وہ انہیں الگ جھولے میں رکھ

دیتا بہت عرصہ سے وہ اس کھیت میں کام کر رہا تھا ـــــ کیونکہ آج اس کا باپ بیمار تھا اس لئے ایک کھیت مزدور کو دو کھیت مزدوروں کا کام کرنا تھا۔

وہ کام کرتے ہوئے آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا ـــــ ان لڑکیوں کو دیکھ کر نہیں جو کھیت کی دوسری سمت سے پھول چنتی ہوئی اس کی طرف آرہی تھیں بلکہ اپنے بازوؤں کی تھکن کو بھلانے کے لئے اور اپنے گیت کی آواز میں اپنی محنت کی آواز کو شامل کرنے کیلئے وہ گا رہا تھا ـــــ یکایک وہ گاتے گاتے رک گیا ـــــ کیونکہ عین اس کے سامنے روئی کے دو گھنے پودوں کے بیچ سے ایک لڑکی اوپر اٹھی اور ـــــ اس کی طرف دیکھ کر بے باکی سے مسکرا دی۔

راگھو راؤ نے کال کوٹھری میں لیٹے لیٹے آہستہ سے اپنی آنکھیں بند کیں اور چندری کو اس طرح دیکھا جس طرح اس نے چندری کو پہلے روز ہی دیکھا تھا۔

تو پہلے تو اسے چندری کے سفید دانت یاد آئے۔ چھوٹے چھوٹے دانت موتیوں کی لڑی کی طرح ـــــ ہونٹوں کے درمیان چمکتے ہوئے ـــــ پھر چندری کی چولی ـــــ بالکل سرخ ہوئی ـــــ جس میں چھوٹے چھوٹے آئینے ٹکے ہوئے تھے اور جب چندری نے گردن موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا تو اسے معلوم

ہوا کہ چولی پیچھے سے کھلی ہے۔ اور سرخ تاگوں کے گہرے نشان جلد کی سپیدی میں گلاب کی رگ کی طرح پھیلے ہوتے ہیں۔

پھر جب چندری اس کی طرف جلدی سے مڑی تو اسے محسوس ہوا کہ چندری کے لٹوں سے جست کے جھومر لٹک رہے ہیں جن کے اندر سرخ مخمل ٹکی ہوئی ہے اور جب اسے مسکرا کر اور کچھ گھبرا کر اپنے گھاگرے کے اوپر سرخ آنچل کو درست کیا تو اسے معلوم ہوا کہ آنچل بھی گہرے سرخ رنگ کا ہے اور پھولدار ہے اور آنچل میں بھی گول گول آئینے ٹکے ہوتے ہیں —— جو دھوپ میں چمکتے ہیں اور رونی کی سفیدی میں آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں ——

اور جب چندری نے روئی کے پودے سے پھول توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو راگھو راؤ کو محسوس ہوا کہ چندری کے ہاتھوں میں پہلے تو کالے سینگ کی ایک چوڑی ہے —— اس کے بعد کلائی سے کہنی تک ہاتھی دانت کی چوڑیاں ہیں اور انگوٹھے کے قریب سبز حرفوں میں اس کا نام گدا ہوا ہے اسی طرح ماتھے پر بندیا گدی ہوئی ہے

بندیا سے جب وہ نیچے آیا تو بہت دیر تک سبزی مائل آنکھوں میں وہ کھویا رہا ——

سبزی مائل آنکھیں ——

بہت صاف کھلا ہوا رنگ ——

اونچا پورا قد ــــ

ہونٹ پتلے ــــ

چندری ــ

اور یہ سب کچھ ایک لمحہ میں ہوا۔

دوسرے لمحہ میں وہ بھی مسکرا دیا ــــ لیکن یہ دوسرا لمحہ مسکرانے والا لمحہ اس قدر ضروری نہ تھا جس قدر پہلا دیکھنے والا لمحہ ــــ پہلے لمحہ کو اس نے کئی بار اپنے پاس بلایا تھا ــــ

جنگلوں میں گھومتے ہوئے

پولیس اور فوج سے چھپتے ہوئے

کاغذ کے کارخانے میں کام کرتے ہوئے

پہاڑیوں کے غاروں میں رہتے ہوئے.

زمیندار کے چابک کھاتے ہوئے

جیل میں بھوک ہڑتال کرتے ہوتے، کئی بار اس نے اس لمحے کو اپنے پاس بلالیا تھا ــــ اور اس سے طاقت حاصل کی تھی ــــ اور کئی بار اس لمحے کو بہت نرم اور شیریں اور کمزور پاکر اسے اپنے پاس سے دور بھگادیا تھا ــــ کئی بار بن بلائے یہ لمحہ اس کے پاس آجاتا تھا۔ اور اسے بہت تکلیف دیتا تھا جیسے صحرا میں جب آدمی پیاسا ہو اور پانی نہ ہو اور پانی

سراب بن کر سامنے آجائے ــــــ

بالکل اسی طرح کی تکلیف راگھو راؤ کو کئی بار ہوئی تھی ــــــ راگھو راؤ اس پہلے لمحہ کی خوب صورتی اور اس کی جانکاہ خلش سے بخوبی واقف تھا۔ اس وقت بھی اس لمحے کو اپنے پاس بلاتے ہوئے اس نے اِک گہری مٹھاس اور گہری چبھن محسوس کی۔

چنڈری لومباڑہ قبیلے کی ایک لڑکی تھی۔ اس کے باپ کا نام بھاگیہ تھا
وہ ایک خوش گلو خانہ بدوش تھا جو اپنے قبیلے کے ساتھ چند روز کے لئے بھا
دتی ندی کے کنارے آن اترا تھا۔
ان دنوں کھیتوں میں روئی کی فصل تیار تھی اس لئے دیش مکھ نے ان خ
بدوشوں کو بھی کام پر لگا دیا۔ اسی لئے چنڈری آج اس لمحے میں زمیندار کے
کھیتوں میں روئی کے گالے اکٹھے کر رہی تھی۔ ورنہ عام طور پر تو وہ جنگل سے
سنبھالو کی لکڑیاں اکٹھی کر کے بیچتی تھی ــــــ یا ببول کا گوند جمع کر کے چھوٹے
چھوٹے قصبوں میں آواز لگاتی تھی۔

ڈِنگ رے لو۔

ڈِنگ رے لو۔

رات کو اس کا باپ دَف بجا کے گاتا تھا ——— اور چُندری اپنے قبیلے میں ناچتی تھی ———

اس پہلے لمحہ کے بعد دوسرے بھی کئی لمحے آئے کیونکہ راؤ نوجوان تھا اور چندری بھی نوجوان تھی ——— اس لئے بیج بویا جائے گا اور فصل کاٹی جائے گی۔ ان لمحوں میں خوشیوں بھرے گیت تھے ——— اور روٹھنے کے انداز تھے اور بدن چرا کر بھاگ جانے کے تیور تھے۔

ایک چڑھتی ہوئی ندی تھی۔

ایک پھیلتی ہوئی لہر تھی۔

اور جب چُندری نے راؤ کو اپنا منگیتر مان لیا ——— تو ایک خوبصورت رقص بھی تھا ——— لیکن اپنے قبیلے میں نہیں ——— کسی دوسرے کے سامنے نہیں ——— صرف اپنے منگیتر کے سامنے ——— جنگل میں ——— ناگیشور کے جھونپڑے کے سامنے چُندری نے اس موقعہ کے لئے سُرخ مدرا کا بنا ہوا موٹا پھولدار گھاگرا پہنا تھا جس پر ڈیڑھ فٹ کی روپہلی گوٹ تھی ——— آدھی پنڈلی ننگی تھی اور ٹخنوں سے اوپر پیتل کے زیور میں سانپ کے پھن لہرا رہے تھے۔

راؤ نے اس رقص کو دیکھا ——— اور اس کے ذہن میں ایک بند پالکی کا

وہ تصور آیا ـــــ جو رنگین اور منقش تھا اور جس کے دونوں طرف لال ریشم کے کاڑھے ہوئے پردے لٹک رہے تھے۔

اور ـــــ جو آج خالی نہیں تھی۔

اور پھر راگھو راؤ کو وہ لمحہ یاد آیا جب روئی کی فصل اکھٹی کر لی گئی تھی اور وہ سہ پہر کے قریب اپنے گھر سے نکل کر بھوگا دتی ندی کی جانب جا رہا تھا۔ جہاں چندری کا تانڈہ اپنے خیمے ڈالے پڑا تھا۔

راستے میں اسے راملو گوالا ملا جو اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا ـــــ مگر اس نے اسے مسکرانے کے سوا کوئی اور بات نہیں کی ـــــ راؤ نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ گو اسے راملو کی مسکراہٹ چبھتی ہوئی معلوم ہوئی ـــــ پھر راستے میں اسے چچا رنگڈو مل گیا ـــــ وہ بھی اس کی طرف دیکھ کر ہنسا مگر راگھو راؤ اپنی خوشی میں مست آگے چلا گیا ـــــ

اس نے سوچا۔

بڈھا چاچا میری محبت پر ہنستا ہے ـــــ کیوں؟ ـــــ میں نے اپنی جات سے باہر محبت کی ہے ـــــ ہنستا ہے تو ہنستا رہے ـــــ

راگھو راؤ احتیاط سے سر جھکا کر سیلو کی جھاڑیوں کے قریب سے نکل کر اس راستے پر ہو لیا جس کے دونوں طرف ناگ پھنی کی جھاڑیاں تھیں اور جو تانڈے کی طرف جاتا تھا ـــــ کوئی آدھا میل چل کر وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں تانڈے

کے گرد گھوم رہے تھے ـــــ قریب ہی قافلے کے خیمے تھے۔ کچھ خیمے پٹ سن کے تھے کچھ تاڑ کے پتوں کے بنے ہوئے تھے۔ مرد چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے اسے بٹ رہے تھے ـــــ کچھ عورتیں شمبھالو کی لچک دار شاخوں سے ٹوکریاں بُن رہی تھیں ـــــ ایک بڈھی ماں اکیلے اکیلے میں ایک جوان سا گیت گا رہی تھی۔ اور نوجوان عورتیں اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔

راگھوراؤ ان سب نظاروں سے گزرتا ہوا بھاگیہ کے خیمہ تک پہنچ گیا بھاگیہ ایک چولہے پر گھی میں پان اور لونگ ڈال کر اسے گرم کر رہا تھا۔

راگھوراؤ نے پوچھا

"اس سے کیا ہوگا ـــــ؟"

بھاگیہ نے آنکھ مار کے کہا

"اس سے ملاوٹ کا گھی بالکل اصلی معلوم ہوتا ہے"

"تو اصلی گھی کیوں نہیں بیچتے ہو ـــــ"

"ارے اصلی گھی بیچیں تو خریدے گا کون ـــــ اتنا تو مہنگا ہوتا ہے اس لئے ہم نقلی گھی کو اصلی کر کے بیچتے ہیں ـــــ"

"چندری کہاں ہے ـــــ"

"آتی ہوگی ـــــ بیٹھو ـــــ"

"ہے کہاں ـــــ؟"

"بنکو گئی ہے زمیندار کے لڑکے نے بلایا ہے"

راگھو راؤ کا دل دھک سے رہ گیا ـــــ توقف کے بعد بولا

"زمیندار کے لڑکے نے کیوں بلایا ہے ـــــ"

"مجھے کیا معلوم ـــــ"

بھاگیہ گھی میں لکڑی کا چمچہ ہلاتے ہوئے بولا

"صبح کی گئی ہے ـــــ اب آتی ہوگی بیٹھو ـــــ!"

راگھو راؤ زمین پر بیٹھ گیا۔

سہ پہر گزر گئی ـــــ شام گزر گئی ـــــ

غروب آفتاب کے بعد کی سرخی بھی آسمان سے جانے لگی ـــــ جب کہیں چندری زمیندار کی بنکو سے پلٹی ـــــ راگھو راؤ کے غصہ سے بھرے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے سہمی ـــــ پھر ہمت کرکے آگے بڑھ آئی اور مسکرادی بولی۔

"تم کب آئے ـــــ؟"

راگھو راؤ نے کوئی جواب نہ دیا

چندری اس کے قریب کھڑی ہوکر آنچل سے کھیلنے لگی۔

"ناگ پھنی کا شربت پیو گے ـــــ؟"

چندری نے بڑی ملائمت سے کہا

"نہیں ــــ"

"تمہارے لئے ٹھنڈا منجل توڑ کے لاؤں ــــ"

"نہیں ــــ نہیں ــــ"

راگھو راؤ غصے سے چلّایا

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے ــــ"

"کیا بات ہے کیوں چلّا رہے ہو ــــ"

چُندری نے حیران ہو کر پوچھا

"تم کہاں گئی تھیں ــــ؟"

"پرتاپ ریڈی نے بلایا تھا ــــ"

چندری بولی

"تم وہاں کیوں گئیں ــــ"

"کیسے نہ جاتی۔ مالک نے جو بلایا تھا ــــ"

چُندری حیرت سے بولی

"وہاں پر کیا ــــ کیا ہوا ــــ؟"

اب تک چندری کھڑی تھی ــــ اس کے بعد وہ بیٹھ گئی ــــ اور بڑے ہونے لہجہ میں بولی

"کوئی نئی بات نہیں ہوئی ــــ وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا ہے"

"ناحشہ ——"

راگھو راؤ غصّہ سے چلّایا۔

"میں ناحشہ نہیں ہوں ——"

چندری نے غصّہ سے چمک کر کہا

میں نے اس سے صاف کہہ دیا —— کہ وہ میرے پاس سب کچھ کر سکتا۔

لیکن میرے سینے پر ہاتھ نہیں رکھ سکتا۔"

"سینے پر ہات نہ رکھنے کا کیا مطلب ہے ؟"

"کیوں کہ اس سے بچّہ دُودھ پیے گا۔"

چُندری نے جواب دیا۔

"بچّہ پیتے وقت ——"

چندری نے بڑی محبّت سے راگھو راؤ کی طرف دیکھا

راگھو راؤ نے نگاہیں نیچی کرلیں وہ غم و غصّہ سے اپنے دل میں

لگا ——

چُندری —— کیا وہ سینہ ہی پاکیزہ ہوتا ہے جس سے بچّہ دودھ

ہے۔ کیا وہ ناف پاکیزہ نہیں ہوتی جو بچے کو لہو دیتی ہے کیا وہ ہو

پاکیزہ نہیں ہوتے جو لوری دیتے ہیں —— کیا وہ بازو پاک نہیں

ہوسکتی تھی ــــ تونے پھر کس لئے اس پاکیزگی کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے۔
چندری نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ اس کے قبیلے کی کسی عورت کے پاس اِن ظلم کا کوئی جواب نہ تھا ــــ

بس وہ چپکے سے رونے لگی

آہستہ آہستہ اس کے آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر خشک زمین میں جذب ہوتے گئے۔ راگھو راؤ اس کے پاس چپ چاپ بیٹھا ان لرزتے ہوئے آنسوؤں کی روانی دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد چندری کے آنسو بھی ختم ہو گئے اور تھوڑی دیر کے بعد خشک زمین پر بھی ان کا نشان نہ رہا

یکایک راگھو راؤ اٹھ کھڑا ہوا ــــ کیونکہ یکایک اس کی سمجھ میں آگیا کہ یہ آنسو آندھرا کی دھرتی کو سیراب نہ کرسکیں گے۔ اس کے لئے کسان کو اپنا لہو دینا ہو گا۔

اس ایک لمحہ میں وہ اپنی محبت کے سارے لمحوں کو پھلانگ گیا
اس ایک لمحہ میں وہ اپنے ذہن کی بہت سی پرانی دیواروں کو پھاند گیا اس ایک لمحہ میں جب وہ زمین سے اٹھا تو ایک بالکل نئے لمحے کا ہات پکڑے ہوئے تھا۔

اس رات وہ اپنے گھر میں نہیں رہا ــــ اس رات وہ گاؤں سے

باہر چلا گیا اس راستے پر جہاں اسے ایک بار وٹّی بن کر جانا پڑا تھا لیکن آج
وہ وٹّی نہیں تھا ـــــ آج وہ آزاد تھا ـــــ آج اس کے ہاتھوں میں
ایک نیا آئینہ تھا ـــ آج وہ اپنے ہاتھوں میں ایک رنگین و منقش مینا
اٹھائے ایک نئی دلہن کی تلاش میں جا رہا تھا۔

اب تک جو کچھ ہوا اسے راگھو راؤ کبھی یہاں سے کبھی وہاں سے اٹھا کے دیکھ سکتا تھا جیسے واقعات کی تاریخ کی بیچ کی کڑی غائب ہو۔ جو زندگی میں شروع سے آخر تک چلتی ہے لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اسے سکوں کی طرح اٹھا کے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ایسا ہوتا کہ جب وہ ایک لمحہ اٹھاتا تو دوسرا لمحہ پہلے لمحے کے ساتھ ہی اوپر اٹھ آتا ——— تسلسل کی ایک رَو تھی ——— جو واقعات کو باندھے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہی تھی ——— کہیں کہیں شدید جھٹکے بھی تھے۔ کہیں کہیں بھٹکانے والے ریگزار بھی تھے ——— مگر ان تمام پیچیدہ تکلیفوں اور صعوبتوں

کے اندر اسے ایک سمت اوپر اٹھتی ہوئی نظر آتی تھی ـــــ مگر ایسا نہ ہوتا۔ تو شاید وہ ان تکلیفوں میں سے نہ گزر سکتا تھا جو اسے گذشتہ تین سال میں پیش آئی تھیں۔

شروع شروع میں تو اسے یہ معلوم بھی نہ ہو سکا کہ وہ کدھر جانا چاہتا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے زندگی کا ایک موہوم سا تصور اس کے پاس تھا ظلم کا ایک اندھا تجربہ تھا ـــــ محبت کی ایک بے پناہ پیاس تھی جو سوریہ سیٹھ میں تین چار ماہ برتن مانجھنے سے نہ مٹ سکی۔

بنئے کی بیوی جس کا وہ ملازم تھا اسے دن بھر کام کرانے کے بعد صرف اتنی روٹی دیتی تھی، جس سے وہ زندہ رہ سکے ـــــ یہی گاؤں میں پرتاپ ریڈی بھی دیا کرتا تھا۔

کبھی کبھی جب بنئے کے ہاں کوئی مہمان آجاتا تو اس رات کو راگھو راؤ کو اکثر سو بھوکا سونا پڑتا ـــــ گاؤں میں بھی اسے کئی بار بھوکا سونا پڑتا تھا باتوں باتوں میں راگھو راؤ کو پتہ چل گیا کہ بنئے کی زمین دیہات میں ہے اور ابھی وہ اور بہت سی زمین خریدنے کی تیاری کر رہا ہے ـــــ برتن مانجھتے مانجھتے راگھو راؤ نے اپنے سامنے ایک چھوٹے سے جگن ناتھ ریڈی کو پیدا ہوتے دیکھا۔

یہ سچ ہے کہ اس بنئے کا مکان بہت بڑا نہیں تھا اس مکان کے باہر

کوئی عالیشان بنگلہ بھی نہیں بنائی گئی تھی لیکن وہ اپنی بھوک کا مقابلہ؛ ایک برتن مانجھنے والے کی بھوک کا مقابلہ گاؤں کے وڈّی کی بھوک سے تو کرسکتا تھا اپنی محنت اور چیلے کا موازنہ وڈّی کی محنت اور چیلے سے تو کرسکتا تھا آہستہ آہستہ اسے محسوس ہوا کہ وڈّی گاؤں ہی میں نہیں ہوتے ہیں ــــ وڈّی تو شہروں میں بھی ہوتے ہیں ــــ ریڈی گاؤں میں ہی نہیں ہوتے، ریڈی شہروں میں بھی ہوتے ہیں ــــ ریڈی خدا نہیں بھیجتا ہے ریڈی آہستہ آہستہ اور دھیرے دھیرے رات کی تاریکیوں میں بنتے ہیں۔

اس بات کا خاص تجربہ راگھو راؤ کو ان لمحوں میں ہوا جب بلنّے نے اسے دو تین بار بلیک مارکیٹ کا سامان ادھر سے ادھر لے جانے کیلئے استعمال کیا ہر بار بلنّے کی تھیلی بھاری تھی ــــ ہر بار راگھو کا پیٹ خالی تھا ــــ یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنی بھوک کا اور تھیلی کا موازنہ نہ کرتا ــــ ایک عمل اس کے سامنے تھا اس کے مثبت اور منفی پہلو ــــ دونوں اس کے سامنے تھے۔

کیسا خطرناک تماشہ اس کے سامنے تھا۔ چگن ناتھ ریڈی کے گھر کے اندر جانے کا کبھی موقعہ نہ ملا تھا ــــ لیکن آج وہ دشمن کے گھر میں موجود تھا۔ جہاں وہ دن رات بلنّے اور اس کی بیوی کی گفتگو سن سکتا تھا اس گفتگو میں روپے اور زمین کا ذکر اکثر ہوتا تھا ــــ اس کی بھوک کا کبھی ذکر نہیں ہوتا تھا۔

دد ایک دفعہ چور بازاری کے سلسلے میں راگھوراؤ کو خیال بھی آیا کہ وہ اس خطرناک تماشہ کو روک دے ــــ مگر کیسے ــــ ؟ اسے گاؤں کی داد رسی کا تجربہ تھا۔ اسے اپنے گاؤں کے مالی پٹیل اور پولیس پٹیل کی ملی بھگت بھی یاد تھی ــــ چونکہ یہ تجربہ اس نے کسی اخبار سے حاصل نہیں کیا تھا بلکہ اپنی زندگی کے ہر لمحے میں پڑھا تھا ــــ چکھا تھا ــــ اس لئے سوریہ بیٹ میں چار مہینہ رہ کر بھی اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ وہ اس سلسلے میں پولیس کے پاس جا سکتا ہے ــــ کوئی لاکھ سمجھاتا مگر اس کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہ گھس سکتی تھی کہ پولیس بھی اس سلسلے میں کچھ کر سکتی ہے اگر کوئی اس سے ایسا کرنے کی کہتا تو وہ شاید چپ ہو جاتا یا ایک زہر خندہ ہنسی میں جواب دیتا۔

جس گلی میں وہ رہتا تھا اس گلی میں اور بھی کئی گھروں میں برتن مانجھنے والے رہتے تھے ــــ شہر کے وٹی ــــ اس کی طرح بہت سے وٹی گاؤں سے آئے تھے ــــ جگہ جگہ سے۔ ہندوستان کے مختلف کونوں سے۔ ان میں ایک دوسرے کے لئے ایک طرح کی ہمدردی بھی تھی۔ یہ لوگ اپنے مالکوں کی غیر حاضری میں بڑی بے باکی سے انہیں گالیاں دیتے تھے جو گاؤں کے وٹی اکثر نہیں کرتے ــــ مگر محض اس بات سے راگھوراؤ کی تسلی نہ ہو سکتی تھی گالی سے دل کی بھڑاس تو نکل جاتی تھی ــــ لیکن پیٹ کی بھوک دور نہیں

ہوسکتی۔

ایک روز جب راگھو راؤ نے اپنے پڑوس کے نوکر دینکٹ سے اس کا ذکر کیا تو وہ بڑے زور سے ہنسا۔ بولا

"راؤ ——— تو بھی بالکل احمق ہے ان باتوں سے کچھ نہیں ملے گا یار میرے بھوک دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مالک تجھے کاٹتا ہے تو اپنے مالک کو کاٹ ——— سبزی میں باجی۔ دال دلئے میں ——— پان سپاری میں ——— اور اگر کچھ نہ بنے تو کسی دن موقعہ دیکھ کر بنیائن کا زیور لے کے بھاگ جا یا اگر ہو سکے تو بنیائن ہی کو لے کے بھاگ جا ——— تو تو جوان ہے اور خوب صورت ہے ——— گاؤں سے نیا نیا آیا ہے ——— تیرے بدن میں ابھی تو کافی خون ہے۔"

یہ کہہ کر دینکٹ زور سے ہنسا ——— اور اس نے زور سے راگھو راؤ کی ران پر ہات مارا۔

دینکٹ اس گلی میں نوکروں کا سردار تھا وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا تھا ——— زندگی میں اس نے بیسیوں نام بدلے تھے اور بیسیوں نام بدلنے کو تیار تھا۔

آس پڑوس بلکہ دوسرے محلوں میں بھی نوکر لوگ جو چھوٹی موٹی چوری کرتے تھے اس میں سے بھی دینکٹ اپنا مال غنیمت دھرا لیتا تھا۔ پھر بہت

سے نوکر ل کے شراب پیتے تھے یا چرس کا دم لگاتے تھے ـــــ اپنے مالکوں کو بے نقط سناتے تھے اور اس کے تھوڑی دیر کے بعد پھر بھیگی بلی بن کر گھروں میں برتن صاف کرنے لگتے تھے ــ

ڈینلٹ نے کئی بار راگھو راؤ کو اپنی ٹولی میں گھسیٹنا چاہا ـــــ مگر راگھو راؤ نہ جانے کیوں الگ الگ سا رہتا تھا ـــــ جانے اسے ان دیٹوں کی کون سی بات ناپسند تھی ـــ

راگھو راؤ نے محسوس کیا کہ تنگ مکانوں کے ڈربے ایک بڑی بستی ہوئی چکی ہیں ـــــ جہاں دھیرے دھیرے غریب لوگوں کو جرائم کی طرف دھکیلا جا رہا ہے ان لوگوں کے اطوار اسے بھیمیا اور درگیا کی یاد دلاتے تھے۔ جو اس کے باپ کے کہنے کے مطابق کبھی ان ہی کی طرح کھیت والے تھے ۔ پھر کھیت مزدور ہو گئے ـــــ پھر وٹی بنے ـــــ اور وٹی سے زمیندار اور دیش مکھ کے غنڈے ـــــ وہ اپنے سامنے چرس کے دم میں ـــــ کچی شراب کی بوتل میں ـــــ پان کی کوکین میں ـــــ اور اغلام زنی میں بھیمیا اور درگیا ایسے بے رحم غنڈوں کو پیدا ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

یہ لوگ جو اسی کی طرح تھے ـــــ اس کے سامنے بدل رہے تھے اور بدل کر گر رہے تھے۔ وہ چند باتیں جو گاؤں میں ان کے پاس تھیں وہ بھی یہاں آن کے کھو رہے تھے ـــــ اور راگھو راؤ کے پاس ایک موہوم بے چینی ، کرب

اور شدید نفرت کے سوا اور کچھ نہ تھا جس سے وہ واقعات کے اس خوفناک دھارے کو بدل سکتا ــــــ

راگھوراؤ نے کسان کی سی سوجھ بوجھ کے ساتھ صرف اپنے آپ کو بچانا چاہا۔ اس نے بڑی دیانت سے بنیے کا کام کیا ــــــ بڑی محنت سے ــــــ جانکاہ کاوش سے، اس کاوش سے جس طرح اس نے گاؤں میں بھی کام نہیں کیا تھا مگر اس سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ــــــ کبھی دن اسے خیرات میں زیادہ روٹی مل جاتی ــــــ بنیائن کی ایک بھونڈی سی مسکراہٹ۔

بڑا اچھا لڑکا ہے ــــــ "

دو چار روز معاملہ ٹھیک رہتا۔ پھر وہی بھوک ــــــ وہی جھوٹے ٹکڑے ایک روز رسوئی سے ایک چھوٹی تھالی گم ہوگئی ــــــ راگھوراؤ پر چوری کا الزام لگا ــــــ بنیائن نے اسے پیٹا ــــــ پھر بنیے نے اسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی۔ بنیا پولیس میں جا رہا تھا کہ تھالی مل گئی کسی دوسرے کمرے میں ایک چارپائی کے نیچے رکھی تھی۔

بنیا اور بنیائن دونوں چپ ہو گئے ــــــ لیکن کسی نے معافی نہیں مانگی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مالک ایک وٹی سے معافی مانگے ــــــ

راگھوراؤ کو یاد آیا کہ کس طرح اسے دن میں دس بار معمولی غلطی پر معافی مانگنی پڑتی ہے مگر خیر وہ تو نوکر ہے۔

جس روز راگھو راؤ پر چوری کا الزام لگا اس روز وہ بے حد اداس تھا ڈینکٹ نے اسے بہلانے کیلئے بہت سے گندے لطیفے سنائے مگر راگھو راؤ کا جی نہ بہلا۔ اس نے اسے چرس کا دم لگاکر زندگی کی کلفتوں کو بھول جانے کی ترغیب دی ـــــ مگر راگھو راؤ اس پر بھی نہ مانا ـــــ لیکن رات کو جب راگھو راؤ گھر کے کام کاج سے فارغ ہوا تو ڈینکٹ اسے زبردستی گھسیٹ کر ادھر لے گیا ـــــ جہاں عورتیں اپنا جسم بیچتی ہیں ـــــ

راگھو راؤ آج تک کبھی ادھر نہیں آیا تھا اس لئے پہلے پہل اسے معلوم نہ ہوا کہ ڈینکٹ اسے کدھر لے جا رہا ہے

ڈینکٹ نے اسے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ اسے آج ایک ایسی مزے دار جگہ لے جائے گا۔ جہاں پہنچ کر وہ اپنی زندگی کی ساری تکلیفیں بھول جائے گا ـــــ راگھو راؤ کے اصرار پر بھی ڈینکٹ نے اسے نہ بتایا کہ وہ اسے کہاں لے جا رہا ہے۔

پھر یکایک راگھو راؤ نے اپنے سامنے ایک عورت کو دیکھا ـــــ دراصل ایک خاص جگہ پہنچ کر ڈینکٹ نے راگھو راؤ کو دھکیل کر آگے کر دیا تھا اور خود پیچھے ہو گیا تھا ـــــ

یہاں پر راگھو راؤ نے دیکھا ـــــ کہ دھواں دھواں کمرے میں پیلا پیلا پلنگ ہے بہت چھوٹا سا کمرہ ہے ـــــ بہت ساری تاریکی ہے اور اس تاریکی

میں ایک عورت مسکرانے کی کوشش کر رہی ہے۔

راگھو راؤ نے پلٹ کر دینکٹ سے پوچھا

"یہ کیا ہے۔"

دینکٹ نے اس کی ہتھیلی پر آٹھ آنے رکھے اور کہا۔

"جاؤ بیٹا ـــــ عیش کرو ـــــ"

اتنا کہہ کر دینکٹ وہاں سے غائب ہو گیا ـــــ کمرے میں وہ عورت اور راگھو راؤ اکیلے رہ گئے۔

عورت نے کہا۔

"بیٹھ جاؤ ـــــ"

اور پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔

مگر راگھو راؤ دیر تک کھڑا رہا ـــــ

دیر تک چپ رہا۔

دیر تک عورت کی طرف گھورتا رہا۔

عورت نے ذرا تلخی سے کہا۔

"کھڑے کھڑے کیا دیکھتے ہو ـــــ بیٹھ جاؤ ـــــ"

یکایک راگھو راؤ نے کھڑے کھڑے وہیں سے پوچھا

"کیا تمہارے سینے پر ہاتھ رکھ سکتا ہوں"

اس عورت کو یہ سوال بڑا عجیب معلوم ہوا۔

مگر ــــــ وہ بولی

" ہاں ــــــ تم نے پیسے دیئے ہیں ــــــ تم تو میرا سینہ کیا ــــ میرے جسم کے ہر کونے پر ہاتھ رکھ سکتے ہو۔"

چند لمحوں کیلئے راگھو راؤ پر جیسے بجلی گر گئی۔

پھر ــــــ راگھو راؤ کے قدم خود بخود کمرے سے باہر چلے گئے

وہ عورت اسے بلاتی رہی ــــــ

مگر راگھو راؤ کے قدم کمرے سے باہر گلی میں چلے گئے ـ وینکٹ اسے آواز دیتا رہا۔ مگر راگھو راؤ گلی کے فرش پر بھاگتا گیا ــــــ پہلے ہولے ہولے ۔ پھر تیز تیز ــــــ دوڑتے دوڑتے اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ سوریہ پیٹ سے بھی بھاگ جائے گا۔ کیونکہ اس کے گاؤں کی عورت نے کم از کم اپنا سینہ تو بچا لیا تھا یہاں سوریہ پیٹ میں عورت نے اپنا سارا جسم بیچ دیا ہے اسے محسوس ہوا جیسے آج کے بعد وہ سوریہ پیٹ میں بھی نہیں رہ سکتا۔

راگھوراؤ کال کوٹھڑی کی تاریکی میں اپنی آورش جذباتیت پر مسکرایا جس
نے اسے سوریہ پیٹ سے بھاگ جانے پر مجبور کیا تھا

سری پورم سے وہ سوریہ پیٹ بھاگا ــــ سوریہ پیٹ سے بھاگ کر وہ
حیدرآباد چلا گیا اور یہاں آکر رکشہ چلانے لگا۔ کیونکہ اس کے بازو مضبوط تھے
اس کا سینہ مضبوط تھا ــــ اس کی ٹانگیں مضبوط تھیں۔ اور وہ بے تکان
چڑھائی چڑھ جاتا تھا اور اسی آسانی سے اترائی اتر آتا تھا

پہلے پہل اسے کنکریٹ کی سڑک پسند آئی ــــ بجلی کی روشنی پسند آئی
اور رکشہ کی گھنٹی پسند آئی ــــ رات کو اسے پیٹ بھر کھانا کھانے کو ملا۔

تو اس نے سوچا کہ اسے منزل مقصود مل گئی رکشہ کے مالک نے اسے دو وردیاں بھی سلادیں تو وہ سب کچھ بھول گیا اور مزے سے پانچ چھ مہینے تک تازی کتے کی طرح حیدر آباد کی سڑکوں پر دوڑتا رہا ـــــ

وہ یہ بھول گیا کہ وہ ایک انسان ہے۔ جسے ایک گھوڑے کی طرح جوتا گیا ہے ـــــ وہ یہ بھول گیا کہ کچھ لوگ ہمیشہ رکشہ میں سوار ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ہمیشہ رکشہ چلاتے ہیں۔

وہ یہ بھول گیا کہ وہ کس مقصد سے آیا تھا ـــــ دو کپڑے دو وقت کا کھانا اور چند روپیوں نے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک خوش رنگ جھلی باندھ دی ـــــ

اور جس دن اس نے اپنے باپ ویریا کو بیس روپے بھیجے اس روز ایسا خوش نصیب آدمی سارے حیدر آباد میں کوئی نہ تھا ـــــ پھر بیڑی کا مزا بہت عمدہ تھا ـــــ سگریٹ کا مزا اس سے بھی عمدہ تھا ـــــ اور گوشت کا مزا تو سب سے عمدہ تھا۔

پانچ چھ مہینے اسی مسرت میں گزرے ـــــ پھر وہ بیمار پڑ گیا اس کا خیال تھا کہ وہ دفعتاً بیمار ہوا تھا۔ مگر ایسا نہیں تھا ـــــ پہلے پہل اسے چڑھائی چڑھتے ہوئے ایک روز چکر آیا تھا ـــــ وہ بڑی مشکل سے سنبھلا تھا ـــــ پھر ایک دن کھانسی ـــــ ہلکی سی کھانسی کا دورہ پڑا تھا

پھر ایک روز اسے بخار ہوا تھا ــــ معمولی سا بخار ــــ پھر یکایک وہ ایک مہینے کے لئے بیمار پڑ گیا۔ اس دوران میں رکشہ کے مالک نے اس کی خدمت کی بھی کیونکہ وہ مالک کا سب سے اچھا رکشہ چلانے والا تھا اور پھر راگھو راؤ نے بھی کچھ پیسے بچا کر رکھے تھے۔ وہ اس بیماری میں اس کے کام آئے اور وہ ایک مہینہ کے بعد اچھا ہو گیا ــــ مگر ابھی تک بدن میں نقاہت باقی تھی۔

پھر وہ ہولے ہولے رکشہ چلانے لگا مگر ہولے ہولے اور تھوڑا تھوڑا کھانستے ہوئے ــــ ڈاکٹر نے اسے دو مہینے مزید آرام کرنے کیلئے کہا تھا۔ مگر وہ کام نہیں کرے گا تو کھائے گا کہاں سے ــــ اس لئے رکشہ چلانا ضروری تھا ــــ گو اب دم پھولتا تھا اور ماتھے پر اور سارے جسم پر پسینہ آجاتا تھا اور وریدیں دورانِ خون سے گویا پھٹنے لگتی تھیں اور پھیپھڑوں میں کبھی کبھار کھانسی کالے دھوئیں کی طرح بگولے کاٹتی تھی ــــ مگر رکشہ چلانا بہت ضروری تھا ــــ

تاریکی پھر لوٹ آئی تھی۔

راگھو راؤ سوچتے سوچتے رک گیا ــــ اس نے ایک جھلتی نگاہ اس ام ہجوم پر ڈالی جو اس کی رکشہ میں سوار ہوا تھا۔ کلرک جو ایک آنے کے ے اس سے جھگڑتے تھے۔ طالب علم جو رکشہ تیز چلانے پر مصر تھے غنڈے

جو رات کی تاریکی میں چھرا لئے گھومتے تھے ـــــ عاشق جو سینما کا پردہ کھینچ کر، رکشہ کا پردہ کھینچ لیتے تھے اور آبرو باختہ عورتوں سے لپٹ کر پیار کرتے تھے ـــــ

اور جب وہ رکشہ چلاتے چلاتے کھانستا تھا تو اسے گندی گالیاں دیتے تھے یا اس کی رکشہ سے اتر کر اسے پیسے دیئے بغیر دوسری رکشہ میں سوار ہو جاتے تھے۔ مولوی جو رکشہ کو بند گاڑی کی طرح استعمال کرتے تھے۔ کھدر پوش جو رکشہ سے ... ان کا کام لیتے تھے۔ بنئے جو رکشہ کو مال گاڑی سمجھتے تھے عورتیں جو رکشہ کو بچوں کا یتیم خانہ سمجھتی ہیں کیسی کیسی مضحکہ خیز صورتوں سے راگھو راؤ کو پالا پڑا تھا۔

گاؤں میں راگھو راؤ نے غم کھانا سیکھا تھا یہاں شہر میں آکے راگھو راؤ نے غم کھا کے مسکرانا سیکھ لیا اور دوسروں پر مسکرانا اور اپنے اوپر ہنسنا سیکھ لیا۔

پھر راگھو راؤ نے اس تمام ہجوم پر ایک نظر ڈال کر اس میں سے ایک ہستی کو انتخاب کیا ـــــ یہ آدمی ایک روز عابد علی روڈ سے رات کو نو بجے اس کی رکشہ میں سوار ہوا ـــــ اس کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں اس کے ... میں بڑی بشاشت تھی جس طرح اس نے رکشہ والے کو اپنے پاس بلایا۔ اس میں نہ کوئی تنفر تھا ـــــ نہ قربت ـــــ بہت اچھا انداز تھا ـــــ سفر

دام بھی اس نے خود ہی بتا دیئے ـــــ جو نہ زیادہ تھے ـــــ نہ کم تھے ـــ بالکل واجب تھے۔ اس لئے اس بات پر بھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا ـــــ راستہ چلتے ہوئے بھی اس آدمی نے کوئی بات نہ کی ـــــ ورنہ رکشہ والے سے اکثر آدمی ایسے بے ڈھب سوال پوچھتے ہیں اور سوال پوچھتے ہوئے یہ بھی نہیں سوچتے کہ رکشہ والے کے پاس سانس اس قدر کم ہوتا ہے کہ وہ اسے بیک وقت رکشہ چلانے اور باتیں کرنے میں صرف نہیں کر سکتا ـــــ وہ یا تو باتیں کر سکتا ہے یا پھر رکشہ چلا سکتا ہے اس لحاظ سے بھی یہ آدمی بہت اچھا تھا۔ آدھا سفر اسی خاموشی میں کٹ گیا۔

اس کے بعد ضیائی روڈ کا ناکہ آ گیا اس آدمی نے آہستہ سے کہا۔

" یہاں سے اختر روڈ کی طرف چڑھنا ہے "

لمبی چڑھائی تھی ـــــ راگھو راؤ کا دم پھول گیا ـــــ وریدیں ابھر آئیں ـــــ اور پھر وہی کھانسی کا چکر چلا ـــــ

اس آدمی نے بڑی نرمی سے کہا۔

" رکشہ روک لو ـــــ "

راگھو راؤ نے کہا

" نہیں صاحب ـــــ فکر نہ کیجئے ـــــ ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا " میں آپ کو لے چلتا ہوں ـــــ

اس آدمی نے نرمی سے کچھ لیکن سختی سے بھی کہا

"رکشہ روک لو ــــ"

راگھو راؤ نے رکشہ روک لیا ــــ اس نے سوچا ــــ اب یہ آدمی مجھے گھور کر یا شاید ایک آدھ گالی دے کر رخصت ہو جائے گا۔ اور میرا کرایہ بھی مار جائے گا۔

مگر اس آدمی نے ایسا نہیں کیا ــــ وہ راگھو راؤ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اور کہنے لگا۔

"یہ چڑھائی تم خالی چل سکو گے نا ــــ آگے جاکے میں پھر سوار ہو جاؤں گا ــــ"

راگھو راؤ نے چلتے چلتے تشکر آمیز نگاہوں سے اس آدمی کی طرف دیکھا اس آدمی کے سیاہ چہرے پر دو بڑی بڑی روشن آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی ہمدردی جھانک رہی تھی ــــ

ہمدردی اور سمجھ اور وقار ــــ ایک عجیب طرح کی قربت ــــ اور دوری ــــ!

اس آدمی نے پوچھا

"کب سے کھانسی آتی ہے ــــ"

"ایک مہینے سے ــــ"

" کہاں رہتے ہو ــــــ "

" گوبند رام کے باڑے میں ــــــ "

" یونین کے ممبر ہو ــــــ "

" کیا ــــــ ؟"

راگھو راؤ کو یہ سوال سمجھ میں نہیں آیا۔

وہ آدمی چند لمحے خاموشی سے راگھو راؤ کی طرف چلتا رہا ــــــ پھر آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے بولا

" جیسے تم رکشہ چلانے والے ہو ایسے اس شہر میں دوسرے رکشہ چلانے والے بھی ہیں ــــــ سب کی تکلیفیں ایک طرح کی ہوتی ہیں اس لئے سب کا علاج بھی ایک طرح کا ہو سکتا ہے اسی لئے رکشہ والوں نے اپنی ایک یونین بنا رکھی ہے جہاں سب رکشہ چلانے والے مل کر بیٹھتے ہیں ــــــ

راگھو راؤ نے اپنے ساتھ چلنے والے آدمی کو بڑے شبے سے دیکھا اس کے ذہن میں سوریہ پرکاش کے نوکروں کی ٹولی گھوم گئی جہاں سب لوگ مل کر بیٹھتے تھے ــــــ!

اس نے خفا ہو کر اس آدمی کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا لیا اور بولا

" نہ صاحب ــــــ میں کسی ٹولی کا ممبر نہیں ہوں ــــــ نہ میں ممبر بننا چاہتا ہوں ــــــ "

وہ آدمی کچھ دیر اور خاموشی سے راگھو راؤ کے ساتھ چلتا رہا پھر اس نے اور ہی طرح کے سوالات پوچھنے شروع کر دیئے

راگھو راؤ کا نام ——— ؟

وہ کہاں سے آیا تھا ———

رکشہ چلانے میں دم کیسے کم پھولتا ہے

اترائی میں رکشہ کو کیسے اتارنا چاہیئے

سستا کھانا کہاں ملتا ہے ؟

سستا مکان کہاں ملتا ہے ؟

جو مالک کھانا اور مکان اور کپڑا دیتے ہیں وہ کتنی رقم رکشہ والے کی محنت سے وصول کر لیتے ہیں ———

بڑی کام کی باتیں تھیں وہ ——— راگھو راؤ بڑے انہماک سے انہیں سنتا رہا چلتے چلتے اسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ چڑھائی کب کی چڑھ آیا ہے کتنے ہی ناکے، گلیاں اور بازار اس کے سامنے سے گزر گئے۔

اور اب ——— وہ دونوں گفتگو کرتے کرتے اس آدمی کے گھر تک آن پہنچے ہیں اور اس راستے میں وہ آدمی ایک منٹ کے لئے بھی اس کی رکشہ میں سوار نہیں ہوا۔

اپنے گھر پہنچ کر اس آدمی نے راگھو راؤ کو پیسے دیئے پھر اُس سے کہا

"ایک پیالہ چائے پی کے جاؤ ——"

راگھو راؤ نے انکار کیا۔

"نہیں نہیں آؤ —— اس وقت بہت سردی ہے ایک پیالہ چائے پیؤ گے تو جسم میں گرمی اور تازگی آجائے گی ——"

اتنا کہہ کر اس نے راگھو راؤ کا ہاتھ پکڑ لیا —— اور اسے اپنے گھر کے اندر لے گیا۔

راگھو راؤ نے دیکھا کہ گھر —— چھوٹا سا گھر ہے —— لیکن بہت صاف ستھرا ہے —— دو کمرے ہیں —— ایک کمرہ —— جس میں وہ داخل ہوا —— دوسرا اس کے اندر —— دونوں کے بیچ میں ایک پھول دار پردہ ہے۔ باہر کے کمرے میں تین کرسیاں پڑی تھیں جن پر گدّے پڑے تھے ایک لمبا سا بنچ تھا —— اس پر بھی ایک نیلا گدّا پڑا تھا —— فرش پر بھورے رنگ کی ایک دری تھی —— اور چاروں طرف لکڑی کے ریکوں میں کتابیں پڑی تھیں ——

ابھی وہ یہاں تک ہی دیکھ پایا تھا کہ اندر کے کمرے سے پھول دار پردے کو ہٹا کر ایک دبلی پتلی سانولی لڑکی نکل آئی —— اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی لڑکی بھی بھاگتی ہوئی آئی اور آتے ہی اس آدمی کی ٹانگوں سے لپٹ گئی جو راگھو راؤ کو یہاں لایا تھا۔

اس آدمی نے مسکرا کر رگھو راؤ سے کہا۔

"میرا نام مقبول ہے ـــــ یہ میری بیوی ہے ـــــ یہ میری بچی ہے آمنہ ـــــ"

پھر اس نے آمنہ کو گود میں لے کر کہا۔

"یہ ہمارا ساتھی راگھو ہے ـــــ اسے سلام کرو بیٹا۔ ـــــ ان کی گود میں جاؤ ـــــ"

آمنہ نے اپنے ننھے ننھے بازو راگھو راؤ کی طرف بڑھا دیئے

راگھو راؤ نے بڑی حیرت سے بڑی مسرت سے آمنہ کو اپنی گود میں اٹھا لیا ـــــ آمنہ اس کے بازوؤں میں آ کے بولی

"ساتھی ـــــ لال سلام ـــــ"

راگھو راؤ نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا ـــــ

آمنہ کی طرف ـــــ

مقبول کی طرف ـــــ

مقبول کی بیوی کی طرف ـــــ

لیکن ان سب کی نگاہوں میں ایک ایسا انوکھا پیار تھا ـــــ ایک ایسی گہری ہمدردی تھی ـــــ ایسی رفاقت تھی ـــــ چہروں پر ایسی معصوم مسکراہٹ تھی جو اسے آج تک کہیں نہیں ملی تھی۔

ان چہروں کو ایک لمحہ حیرت سے دیکھ کر گو اسے یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ لال سلام کسے کہتے ہیں لیکن ان مسرت بھرے چہروں سے اس نے اتنا اندازہ لگا لیا کہ یہ لال سلام کوئی اچھی چیز ہی ہوگی۔

اس لئے اس نے آمنہ سے جھجکتے جھجکتے کہا

" لا ــــ ل ــــ سلام ــــ "

آمنہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ــــ ۔

مقبول کی بیوی بھی ہنسی ــــ

مقبول بھی مسکرایا ــــ اور پھر ایک گدّی دار کرسی پر بیٹھ کر اپنی بیوی سے کہنے لگا۔

" یہ ساتھی اس وقت کھانا یہیں کھائے گا ـ "

راگھو راؤ نے پھر حیرت سے مقبول کی طرف دیکھا ــــ مگر اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

فرش پر چھوٹے سے دسترخوان پر چینی کے صاف ستھرے برتنوں میں سب نے مل کر کھانا کھایا ــــ آمنہ راگھو راؤ کی گود میں بیٹھی تھی اور اس سے اس طرح لقمے طلب کرتی تھی جیسے وہ بچپن میں اپنے باپ سے لقمے مانگا کرتا تھا ــــ اسے ان ننھے ننھے ہاتھوں کی طلب بہت پیاری معلوم ہوئی ــــ مقبول کی بیوی ثریا کا اس کی پلیٹ میں بار بار گوشت کا

کوئی اچھا سا ٹکڑا ڈال دینا بہت بھلا لگا۔

مقبول چپکے سے کھانا کھاتا رہا ـــــ راگھو راؤ اس سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا ـــــ

ساتھی کِسے کہتے ہیں۔

لال سلام کا کیا مطلب ہے۔

اور سب سے بڑھ کر اس محبت اس خلوص اس رفاقت کا کیا مطلب ہے ـــــ وہ یہ سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ثریا نے دسترخوان ہٹا لیا اور اس کے لئے گرم گرم قہوہ کی ایک پیالی لے آئی ـــــ

قہوہ پی کر راگھو راؤ نے مقبول کی طرف دیکھا ـــــ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ مقبول نے کہا۔

"جب تک تمہیں کھانسی کی شکایت ہے ـ ـ ـ تمہیں رات کو کام نہیں کرنا چاہیئے ـــــ"

راگھو راؤ چپ رہا۔

مقبول بولا

"ہماری یونین کا ایک ڈاکٹر ہے ـــــ تم اس سے علاج مفت کرا سکتے ہو ـــــ"

راگھو راؤ چپ رہا۔

مقبول بولا —— ' اتنی سردی میں تم باڑے جا کے کیا کرو گے۔ یہیں سو رہو "

یکایک راگھو راؤ نے پوچھا

" ساتھی کا کیا مطلب ہے —— ؟

مقبول آہستہ سے اپنی کرسی سے اٹھا اس نے ثریا سے کہا

' ثریا —— آج ساتھی یہیں سوئے گا۔ '

ثریا نے اندر سے ایک بستر نکالا اور اسے بھوری دری پر بچھا دیا مقبول نے کتابوں کے ریک سے ایک کتاب انتخاب کی اور پھر راگھو کے پاس آ بیٹھا دونوں نے لحاف اوڑھ لئے۔ ٹیبل لیمپ کی سائے دار روشنی میں مقبول نے کتاب کھولی۔ راگھو راؤ نے بے اختیار کتاب کے چکنے صفحوں کو ہاتھ لگا دیا

مقبول نے کتاب اس کے آگے کر دی —— راگھو راؤ نے بڑی محویت کے عالم میں کتاب کے چکنے چکنے صفحوں پر ہاتھ پھیرا ——

الفاظ تو وہ پڑھ نہ سکتا تھا —— لیکن ہاں کاغذ کا لمس —— رنگین ریشم کے لمس کے برابر تھا ——

اس نے آہستہ سے کتاب مقبول کے ہات میں دے دی۔

مقبول نے کتاب کھولی۔

ایک صفحہ پر دنیا کا نقشہ بنا ہوا تھا —— مقبول نے پہلے اپنے ملک پر

انگلی رکھی اور کہا۔

"یہ ہندوستان ہے ـــــ ہمارا دیس ـــــ"

پھر اوپر شمال کی طرف کے ایک ملک پر انگلی رکھی ـــــ اور کہا ـــــ آج سے تیس سال پہلے یہ ملک بھی ہمارے ملک کی طرح ڈبیوں کا ملک تھا۔

رات بہت گہری تھی —— کہانی بہت لمبی تھی ——

لیکن اس رات کا ایک ایک لمحہ اور اس کہانی کا ایک ایک لفظ راگھو راؤ کے لئے قیمتی تھا —— اسے محسوس ہوا کہ اس نے چندری کے پاکیزہ سینے میں جس نخلِ نو بہار کا پرتو دیکھا اس کی جھلک ان لفظوں میں موجود ہے۔

اپنے سینے میں وہ صدیوں کی اَن بجھی پیاس لے کے آیا تھا اس کی سیرابی یہاں ناممکن ہے —— بنکو کی جس پرشکوہ محراب نے اس کا سر جھکا دیا تھا اس سے بڑی بڑی محرابیں دلّی کی قوّتِ عمل نے جھکا ڈالی ہیں ——

الفاظ مقبول کے دل سے نکل رہے تھے اور راگھو راؤ کے دل میں اترتے

جا رہے تھے ـــــ اور بیج کی کوئی طاقت نہ تھی جو انہیں روک سکتی ـــــ راگھو راؤ کو سمت مل گئی تھی ـــــ اس نے رستہ پا لیا تھا ـــــ پہلے جس چیز کا کوئی مطلب نہ تھا آج اس میں اسے معنی نظر آنے ـــــ جہاں اندھا تجربہ تھا وہاں روشنی کی لہر دوڑنے لگی ـــ جہاں احساس کو کنارہ نہ ملتا تھا وہاں اسے مضبوط دھرتی نظر آئی۔ اور راگھو راؤ نے بڑی مضبوطی سے اس دھرتی پر اپنے قدم رکھ دیئے اور اپنے دل میں کہا

میں جوان ہوں ـــــ اور یہ جو کچھ میں سن رہا ہوں ـــــ یہ بھی جوان ہے ـــ اس لئے بیج بویا جائے گا۔ اور فصل کاٹی جائے گی۔

اور راگھو راؤ کو آج تک بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس رات کب تک کتنی دیر تک جاگتا رہا۔ کب سویا۔

اسے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ اور مقبول دونوں لحاف میں بیٹھے ہوئے تھے ـــــ وہ سن رہا تھا ـــــ اور مقبول سنا رہا تھا ـــــ اور قریب ہی فرش پر ایک طرف ثریا سو رہی تھی اور اس کے پاس ننھی آمنہ ہلکے ہلکے سانس لے رہی تھی۔ اور اس کا ایک ننھا سا ہاتھ بستر سے باہر نکلا ہوا تھا اور کمرے میں ٹیبل لیمپ کی دودھیا روشنی دیوار کے سایوں میں لرز رہی تھی۔

اس کے بعد اسے یہ یاد نہیں کہ وہ کب سویا ـــــ صرف اتنا یاد ہے کہ

بہت رات گئے یکایک اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے دیکھا کہ اس کے پاؤں
لحاف سے باہر نکلے ہوتے ہیں اور ثریا لحاف کو اس کے پاؤں میں موڑ رہی ہے
لحاف کو موڑنے میں ثریا کی انگلیاں راگھوراؤ کے پاؤں سے چھو گئیں اور جانے
اس کے کن نازک سے احساسات کو ان انگلیوں نے چھو دیا کہ اس کی آنکھیں
آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں اور اس نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ثریا
کو اس کے بستر سے گھوم کر معقول کے بستر کا لحاف ٹھیک کرتے ہوئے دیکھا
پھر اپنی بچی کے بستر کی سلوٹیں دور کرتے ہوئے دیکھا پھر یکایک اطمینان کا
سانس لے کر ثریا اپنی آمنہ کا ہات اپنے ہات میں لے کر سو گئی اور راگھوراؤ
کی آنکھوں سے آنسو باہر چھلک آئے لیکن راگھوراؤ نے ان آنسوؤں کو پونچھا
نہیں کیونکہ یہ غم کے آنسو نہیں تھے — یہ خوشی کے آنسو تھے — وہ آج
اپنے گھر آیا تھا۔

راگھو راؤ چند لمحوں کے لئے مقبول اور اس کے گھر کی تصویر پر رکا رہا پھر کسی نے اس کے سلسلۂ خیال کو توڑ دیا ——— پہلے آہنی زنجیروں کے کھنکنے اور پھر کال کوٹھڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی ——— لیکن راگھو راؤ اپنی جگہ سے ہلا نہیں ——— کیونکہ وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا ——— پھر اسے فرش پر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی ——— دو وارڈروں نے آکے اس کے بازو آہنی حلقوں سے آزاد کئے۔

جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے اسے کھڑا ہو جانے کو کہا ———
راگھو راؤ آہستہ سے اٹھا ——— اٹھنے کی سُرعت اس کے رگ و پے

ںیں ایک لمحہ کیلئے دوڑ گئی ـــــ

دوسرے لمحہ میں ڈنڈا بیڑی اس کے گھٹنوں سے ٹکرائی اور اُس کے گھٹنوں کے زخم میں شدید چبھن اور درد کا احساس بڑھ گیا ـــــ پھر بھی ہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔

سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ میں ایک بھدا کاغذ تھا ـــــ اس کے ہات کانپ رہے تھے ۔ راگھوراؤ نے دیکھا کہ حکم پڑھتے وقت سپرنٹنڈنٹ کے ہر جذبات سے عاری چہرے پر بھی پسینہ کی بوندیں نمودار ہو گئی ہیں اس میں راگھوراؤ کی اپیل نامنظور کی گئی تھی اور اس کی سزائے موت قرار رکھی گئی تھی۔

کل صبح سات بجے اس کو پھانسی دی جائے گی۔

سپرنٹنڈنٹ نے رومال سے اپنا چہرہ پونچھا اور قیدی سے دریافت ا ـــــ "

" تمہیں کچھ کہنا ہے ـــــ "

جواب میں راگھوراؤ صرف مسکرایا۔

چند لمحوں کے لئے سپرنٹنڈنٹ راگھوراؤ کو گھورتا رہا ـــــ ایسے قیدی سے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا ـــــ اپنی تیس سال کی لمبی ملازمت میں نے ہر طرح کے قیدی دیکھے تھے ، بڑے بڑے جرّی ، ڈکیت ، جنہیں

پھانسی کا کوئی ڈر نہ تھا ـــــ لیکن وہ بھی پھانسی کا حکم سنتے ہی سرکار کو یا
جج کو گالیاں دینے لگتے تھے ـــــ
قیدی ـــــ جو رونے لگتے تھے۔
قیدی ـــــ جن کا پیشاب خطا ہو جاتا تھا
قیدی ـــــ جو پاگلوں کی طرح کاٹ کھانے کو دوڑتے تھے
قیدی ـــــ جو ہات جوڑ کر بھگوان سے دعا مانگنے لگتے تھے ـــــ لیکن
ایسا قیدی اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جو پھانسی کا حکم سن کر اس طرح خاموشی
سے مسکرا دے ـــــ
سپرنٹنڈنٹ جیل نے گھور کر قیدی کے چہرے کی طرف دیکھا ـــــ شاید
وہ اس مسکراہٹ کے پیچھے کسی ڈر ـــــ کسی تمنا کسی خفتہ کمزوری کو ابھر
ہوا دیکھنا چاہتا تھا ـــــ لیکن جیل سپرنٹنڈنٹ اس کام کے لئے موزوں نہ
تھا اس نے اپنی ساری زندگی میں مجرموں کے چہرے پڑھے تھے وہ ایک
انسان کا چہرہ کیسے پڑھ سکتا تھا۔
سپرنٹنڈنٹ نے دل ہی دل میں کچھ خفیف ہو کر کچھ خفا ہو کر کال کو
سے جلدی جلدی قدم بڑھا کر رخصت ہو گیا
اس کے جانے کے بعد دونوں وارڈ خاموشی سے دیر تک کھڑے رہے
آپس میں سرگوشی کرنے لگے ـــــ

آخر ان میں سے ایک وارڈر جو زیادہ معمّر معلوم ہوتا تھا ۔۔۔ آگے بڑھا اور بولا۔

" ہم کو آرڈر ہے کہ تم کو باندھ کے رکھنا ۔۔۔ پر ہم کو تم کو باندھ کے نہیں رکھے گا ۔۔۔ ہم تمہارے باجو باندھ کے نہیں رکھے گا ۔۔۔ تم کو ادھر کوٹھری میں چل پھر سکتا۔ "

راگھو راؤ نے کہا۔

" اگر تمہاری نوکری جاتی ہو تو مجھے پھر باندھ کے رکھ دو "

اب دونوں وارڈر بولے

" نہیں ۔۔۔ ہم کو کوئی پھکر نہیں ہے ۔۔۔ "

راگھو راؤ چپ ہو گیا۔

پھر بڈھا وارڈر آگے آیا آہستہ سے بولا۔

" تم کو کچھ کھانا مانگتا ۔۔۔ کوئی چیج ۔۔۔ مٹھائی ۔۔۔ سربت ۔۔۔ ہم کو بولو ہم لا کے دے گا ۔۔۔ "

راگھو راؤ نے کہا۔

" مجھے کچھ نہیں چاہیئے ۔۔۔ صرف اتنا بتا دو ۔۔۔ اب وقت کیا ہے ۔۔۔ "

بڈھے وارڈر نے باہر جا کے غلام گردش میں کلاک کو دیکھ کے کہا۔

"اب پانچ کلاک کا ٹائم ہے ـــــ ابھی ساری رات پڑی ہے ـــ"

راگھو راؤ نے منہ پھیر لیا۔

دونوں وارڈر سر جھکائے وہاں سے چلے گئے۔ پھر زنجیریں بجیں۔ پھر کال کوٹھڑی بند ہوئی ـــــ پھر آہنی تالے گرنے کی آواز آئی۔ جیسے کسی گہرے کنوئیں میں بھاری پتھر گر جائے۔

اس کے بعد گہرا سناٹا۔

مکمل سناٹا۔!

راگھوراؤ ٹانگیں پھیلا کر کال کوٹھڑی میں آہستہ آہستہ چلنے لگا تاکہ چلتے چلتے ڈنڈا بیڑی اس کے گھٹنوں کے زخموں سے نہ لگ جائے وہ صرف چار قدم چل سکتا تھا ــــ اس کے بعد دیوار آجاتی تھی۔ چاروں دیواروں میں صرف چار قدم کا فاصلہ تھا۔

ایک ۔ دو ۔ تین ۔ چار

ایک ۔ دو ۔ تین ۔ چار ....

ہر چار قدم چلنے کے بعد اس کے قدم رک جاتے ــــ اور اُسے مڑنا پڑتا ــــ

اس کوٹھری میں وہ ٹانگیں پھیلا کے کبھی نہ سو سکتا تھا ــــ راگھو راؤ نے ایک نئی حیرت سے اپنے جسم کو دیکھا ــــ اپنے بازوؤں کو ــــ اپنی ٹانگوں کو ــــ اپنے سینے کو ــــ اس نے اپنی ناک ــــ کان اور منہ کو ہات لگایا ــــ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی ــــ صحیح سلامت تھی ــــ گرم تھی ۔ اور زندہ تھی ــــ سانس لے رہی تھی ــــ اور حرکت کر رہی تھی۔

کل یہ گرمی ــــ یہ حرکت ــــ یہ زندگی ــــ یہ سوچ ــــ افکار کی اڑان بازوؤں کی جنبش ــــ سینے کا زیر و بم ــــ احساس کا تناؤ ــــ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے گا ــــ کس لئے ۔؟

موت سے اسے کوئی ڈر نہ تھا ــــ پیدا ہونا ــــ بڑھنا ــــ بدلنا اور بدل کر سپنے کی طرح خوبصورت ہو جانا ــــ پھر آہستہ آہستہ خزاں رسیدہ بڑھاپے کی طرف جانا ــــ اور اپنے خاتمہ میں ایک نئی زندگی کے آغاز کو دیکھتا تھا۔

مگر ــــ یہ کل کا مرنا کیسا ــــ

ابھی تو وہ بوڑھا نہیں ہوا تھا۔

ابھی تو اس کے جسم پر ایک بھی خزاں رسیدہ پتہ نہ تھا۔

ابھی کلیاں کھلی نہ تھیں۔

شگوفے پھوٹے نہ تھے ــــ

شاخساروں پر پھول آئے نہ تھے۔
ابھی بادل برسے نہ تھے۔
دھنک چمکی نہ تھی ——— بلبل چہکی نہ تھی ——— اور کوئی درخت
بلبل کے متعلق مکمل نہیں ہوتا۔

راگھو راؤ کال کوٹھری کے ٹھنڈے سیلے فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا اس نے اپنی ٹھوڑی ڈنڈا بیڑی کی نوک پر رکھ دی اور سوچنے لگا۔

مقبول نے ڈاکٹر سے اس کا علاج کرایا تھا۔
مقبول نے اسے پڑھنا لکھنا سکھایا تھا۔
مقبول نے تھوڑے عرصہ کے بعد اس کا رکشہ چلانا بھی چھڑا دیا جس سے اس کے پھیپھڑوں پر مضر اثر پڑتا تھا۔ اور اسے کاغذ کی مل میں نوکر کرا دیا۔ مل میں آکر اس نے اس کھلی سازش کا وسیع سلسلہ دیکھا۔ جو ہندوستان کے شہروں کے بڑے بڑے سرمایہ داروں سے گاؤں کے زمینداروں تک پھیلا ہوا تھا۔ جس کی جڑیں زندگی کے ہر شعبے میں زہر کی لکیر کی طرح پھیلی ہوئی تھیں ——— جہاں ہر قدم پر نئی زندگی کو آگے بڑھنے کے لئے -- حالات کو بدلنے کیلئے انسان کو بہتر بنانے کے لئے پرانی زندگی سے ٹکر لینا پڑتی تھی ———

مل میں آکر راگھو راؤ نے لڑنا سیکھا ——— نہ صرف لڑنا سیکھا۔ بلکہ

حیاتِ نو کے اس حسن کار کو دیکھا جس کے ہاتھوں میں لکڑی کے پرانے ٹکڑے اور کپڑوں کے گلے سڑے چیتھڑے ــــ کاغذ کے حسین ورق میں بدل جاتے ہیں ــــ

اس نے دیکھا کہ ان ہاتھوں میں لوہے کی مردہ دھات دل کی طرح سے دھڑکنے لگتی ہے اور پگھل کر کسان کا ہل ــــ موٹر کا پرزہ اور پھول پرونے والی سوئی بن جاتی ہے۔

جب اس نے زندگی کی اس حسن کاری کو دیکھا تو اسے زمین میں دبی ہوئی ان صدیوں کا خیال آیا جو کوئلے میں تبدیل ہو گئی تھیں ــــ اس زنگ کا خیال آیا جو لوہے کی دھات میں ڈھل گیا تھا ــــ اس حسن کا خیال آیا جو ریڈیم میں منجمد ہو گیا تھا ــــ۔ اور جب اسے اس کا خیال آیا تو اس کا سر غرور سے بلند ہو گیا۔ اور اس نے بڑی مضبوطی سے اپنے ساتھیوں کے ہات پکڑ لئے ــــ کیونکہ یہی ہات تھے جو زمین کے ان دبے ہوئے خزینوں کو تاریک گہرائیوں سے چھین سکتے تھے۔ اور انسان کی زندگی کو بہتر اور حسین بنا سکتے تھے ــــ

اب وہ ان ہاتوں کو کبھی نہیں چھوڑے گا ــــ کیونکہ یہ مستقبل بیچنے والے منافع خوروں کے ہاتھ نہیں تھے۔ مزدوروں کے ہاتھ تھے جو نئی زندگی کے فن کار تھے۔

مل کی ایک سال کی نوکری میں اس نے بہت کچھ سیکھ لیا جو وہ شاید دس سال کی کش مکش میں بھی دوسری جگہ اس قاطع صفائی سے نہ سیکھ سکتا تھا اس نے خود اعتمادی سے لڑنا ــــ شکست سے گھبرانا اور سٹرائیک سے لڑائی کو آگے لے جانا سیکھ لیا۔

یہاں پر بھی اس کا مقابلہ مل مالکوں کے غنڈوں سے ہوا تھا اور ان غنڈوں کے مزاج میں وہی عنصر شریک تھے جو اس کے گاؤں میں دیس مکھ کے غنڈوں میں تھے۔ لیکن یہاں ان غنڈوں کا علاج گاؤں سے آسان تھا پھر بھی کئی بار اس پر حملے ہوئے ــــ کئی بار اسے چھرے اور لاٹھیوں کا سامنا کرنا پڑا ــــ مل سے برخواست ہوکر چھ مہینے کے لئے اسے جیل جانا پڑا۔

جیل میں اس کی ملاقات ناگیشور سے ہوئی ــــ اپنے گاؤں کے گوالے ناگیشور سے ــــ اور راگھو راؤ ناگیشور کو جیل میں دیکھ کر بہت حیران ہوا ــــ مگر جلد ہی ناگیشور نے اس کی حیرانی کو دور کر دیا۔

ناگیشور نے اسے بتایا کہ شری پورم کا گاؤں اب وہ پرانا گاؤں نہ رہا تھا۔ وہاں بھی زندگی بدل رہی تھی۔ صدیوں کے پچھلے ہوتے دبوں نے ــــ کھیت مزدوروں نے، گوالوں نے ــــ اور جنگل میں رہنے والے کویا لوگوں نے یعنی ان تمام لوگوں نے جن کے پاس کوئی زمین نہ تھی

اپنی ایک سبھا بنالی تھی اور یہ سب مل کر جگن ناتھ ریڈی سے جن کے پاس ۴۰ گاؤں کی زمین تھی اپنی دھرتی کا مطالبہ کرتے تھے ——— ہر روز مار دھاڑ ہوتی تھی ——— ریڈی پکڑے جاتے تھے ——— ان پر طرح طرح کے ظلم ہوتے تھے۔ مگر آگ پھیل رہی تھی اور ریڈی لوگ شیر ہوتے جا رہے تھے کئی جگہوں پر ریڈیوں نے زمیندار کی مرضی کے بغیر زمین میں بوائی شروع کر دی تھی۔ ناگیسور کو اسی سلسلے میں پکڑ کر جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔

راگھوراؤ کو یہ سب باتیں سن کر بڑی حیرت ہوئی اور مسرت بھی ہوئی۔ اسے اس بات پر ایک طرح سے اب بھی یقین نہ تھا ——— کہ جنگل کے رہنے والے قبائلی زندگی میں پسے ہوئے کویا لوگ بھی اس درجہ بہادر ثابت ہو سکتے ہیں ہزاروں سال کی غلامی کو پھاند کر چند لمحوں میں نئے انسان بن سکتے ہیں۔

ناگیشور نے کہا۔

" کویا لوگ تو اس لڑائی میں سب سے آگے ہیں تم ان کی جماعت بندی دیکھو تو حیران رہ جاؤ ——— اور ہمارے گوالے بھی تم ریڈیوں سے آگے نکل گئے ہیں کیا سمجھتے ہو تم ہم گوالوں کو ——— "

ناگیشور ہنسا ——— اور اس نے اپنے سر پر ہنستے ہوئے ہات پھیرا پھر اس کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"کیا بات ہے ——"

راگھو راؤ نے پوچھا۔

ناگیشور نے اپنا سر جھکا کے اسے اپنے ماتھے کا وہ نشان دکھایا جو ماتھے سے شروع ہو کر سر کی چوٹی تک جاتا تھا ——

ایک گہرا لمبا چتلا نشان۔

جیسے کسی نے جلد جلا ڈالی ہو۔

اور راگھو راؤ نے دیکھا کہ واقعی اس لمبے چتلے نشان پر ایک بال بھی نہ تھا۔

"یہ کیسے ہوا ——"

راگھو راؤ نے بڑی بے چینی سے پوچھا

"جب ہمیں پکڑ کے لیجایا گیا —— ناگیشور آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ تو ہمیں میندار کے اصطبل میں بند کر دیا گیا مجھے سب سے الگ بند کر کے رکھا تھا دو ن کھانے کے لئے کچھ نہیں دیا —— مار پیٹ بھی کی —— مگر میں نے اپنے ساتھیوں کے نام نہیں بتلائے —— پھر ان لوگوں نے یہاں میرے سر کے بال جلا لے اور لوہے کی ایک کیل سے میری جلد کی کھال ادھیڑ ڈالی ......

وہ میری جلد کی کھال ادھیڑتے جا رہے تھے اور ہنستے ہوئے کہتے تھے "ہم تمہارے سر پر ماسکو روڈ بنا رہے ہیں یہاں سے تم سیدھے ماسکو پہنچ جاؤ

گئے ــــ سمجھے ــــ ۔ مگر میں کیا سمجھتا ــــ میں تو درد کی شدّت سے بے حال ہو کے بیہوش ہو گیا ــــ

ناگیشور بہت دیر تک چپ رہا ــــ راگھو راؤ بھی کچھ نہ بول سکا۔ آخر ناگیشور نے اپنے سر کو سہلاتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے راگھو راؤ سے پوچھا۔

" بھیا ــــ ماسکو کہاں ہے ــــ "

راگھو راؤ نے کہا

" تم نہیں جانتے ــــ "

ناگیشور نے سر ہلا کے کہا

" نہیں بھیا ــــ "

راگھو راؤ نے کہا

" ماسکو ایک شہر ہے ــــ " اور پھر رک کر کہا ــــ " اور ماسکو ایک جگہ بھی ہے ــــ "

ناگیشور کچھ نہیں سمجھا ــــ اس نے بے بسی سے سر ہلا کے کہا

" بھیا ــ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں ــــ میں تو جنگل کا گوالا ہوں ۔ تو اتنا جانتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں ۔ اور میں نے تو کیا میرے باپ نے اور میرے باپ کے پرکھوں نے کبھی جنم جنمانتر میں زمین نہیں دیکھی تھی

جو ہمیں زمین ملنے کی آس ہے تو ہم جیتے جی اس آس کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔
راگھوراؤ نے کہا۔
"ای آس کا نام ماسکو ہے۔"
ناگیشور نے بڑی سختی سے کہا۔
"اگر ایسا ہے تو پھر ہوا کرے پھر چاہے وہ میرے سر پر کیا میرے سارے بدن پر بھی ماسکو روڈ بنا دیں میں اس آس کو کبھی نہیں چھوڑوں گا"
راگھوراؤ نے ناگیشور کا ہات زور سے دبایا کہنے لگا۔
"جیل سے چھوٹ کر میں تمہارے ساتھ اپنے گاؤں واپس جاؤں گا۔"

مگر جس دن راگھو راؤ رہا ہوا ـــــ اس دن ناگیشور رہا نہیں ہوا ابھی اسے پندرہ دن اور جیل کاٹنی تھی۔ اس لئے راگھو راؤ کو اکیلے ہی اپنے گاؤں جانا پڑا جیل کے دروازے پر مقبول اور دوسرے ساتھی اس کے استقبال کے لئے موجود تھے۔

جب راگھو راؤ نے مقبول کو بتایا کہ وہ اپنے گاؤں واپس جانا چاہتا ہے تو مقبول بہت خوش ہوا اس کا خود اپنا بھی یہی خیال تھا کہ راگھو راؤ واپس اپنے گاؤں جاکے کسانوں کی تحریک کو دیکھنا چاہیئے ـــــ حالات بہت نازک ہو رہے ہیں۔ مقبول نے بتایا کہ کسانوں کی زبردست تحریک اب

نظام شاہی پولیس کے دباتے نہیں دیتی اس لئے نظام شاہی پولس اور رضاکاروں کی فوج مل کر جگن ناتھ ریڈی کے علاقہ میں کسانوں کو کچلنے کی کوشش کر رہی ہے۔

"مگر ——"

راگھو راؤ نے پوچھا

"یہ جگن ناتھ ریڈی تو ہندو ہے اور رضاکاروں کی انجمن اسلامی جماعت ہے پھر ان دونوں میں تال میل کیسا؟

مقبول نے کہا۔

"منافع اور ظلم کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ پھر ہمارے دیس کا تو یہ دستور ہی ہے کہ جب رجعت پسند طاقتیں ہارنے لگتی ہیں —— تو فرقے داری کا سہارا لیتی ہیں ——"

چلتے وقت مقبول نے راگھو راؤ کو چند پتے بتائے —— جہاں وہ اپنے رستہ میں رک سکتا تھا اور ان لوگوں سے مل سکتا تھا جنہیں مقامی حالات سے بخوبی آگاہی تھی انہیں حفظ کر کے اور مقبول دوسرے ساتھیوں سے بغل گیر ہو کر راگھو راؤ اپنے گاؤں کو روانہ ہو گیا۔

جوں جوں راگھو راؤ حیدرآباد سے دور ہوتا گیا اور دیہات میں بڑھتا گیا اسے سماجی ابتری، پریشانی اور ہراس کے آثار بڑھتے ہوئے دکھائی دیئے ـــــ

شروع شروع کے دیہات میں تو اسے کسان لوگ کام کرتے ہوئے ملے تھے مگر جوں جوں وہ حیدرآباد سے دور ہوتا گیا اس کے سامنے پھیلے ہوئے منظر میں انسان کا وجود کم دکھائی دیا۔ نیم کے پیڑ تھے ـــــ پیپل کے درخت تھے ـــــ باجرے کے کھیت تھے ـــــ سیلو کی جھاڑیاں تھیں کیکر کے درختوں پر آکاش بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور جگہ جگہ راستے کے ٹیلوں پر

ایک سیاہ چٹان کے اوپر دوسری چٹان اور اس کے اوپر تیسری چٹان اس طرح ایستادہ تھی، گویا کسی دیو بچے نے کھیلتے وقت انہیں ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیا ہو ——

یہ سب اس کے جانے پہچانے منظر کی جزویات تھیں —— مگر وہ جس نے باجرے کے کھیت بوئے تھے جس نے کھیت کی مینڈھوں میں آم دم کے پیڑ اگائے تھے —— جس نے کنوئیں کھودے تھے اور گاؤں اور کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیاں بنائی تھیں —— یعنی وہ ہستی جس سے فطرت میں حرکت —— قدرت سے تناسب اور ماحول میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے وہ ہستی غائب تھی۔

تصویر کی باقی سب جزویات وہی تھیں
وہی رنگ تھے۔

وہی ماحول تھا —— جو اس کی زندگی میں بچپن سے رچا ہوا تھا مگر پھر بھی آج ہر چیز نہ جانے کیوں اوپری اوپری سی دکھائی دیتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اس تصویر کے مرکز میں ایک سوراخ کر دیا ہو بار بار راگھو راؤ کی نگاہیں اس پر پڑتی تھیں اور پھر لوٹ کر آس پاس کسی شئے کو تلاش کرنے لگتی تھیں

موضع کریم نگر میں اسے پلّا ریڈی سے ملنا تھا —— مگر جب وہ گاؤں

کے قریب پہنچا تو اسے سارا گاؤں جلا ہوا نظر آیا ـــــ پچاس ساٹھ گھر تھے مگر سب راکھ ـــــ جو پھونس اور تاڑ کے چھپر تھے وہ تو بالکل راکھ ہو چکے تھے۔ صرف تھوڑے سے گھروں کی مٹی کی دیواریں رہ گئی تھیں یلاّ ریڈی کا مکان بھی ایک منزلہ تھا اور خام مٹی کا بنا ہوا تھا مگر اس گھر کی حالت دوسروں سے بہتر تھی۔ کیونکہ یلاّ ریڈی کی مالی حالت بھی گاؤں کے دوسرے مکینوں سے بہتر تھی۔

اس گھر کی صرف دیواریں کھڑی تھیں ـــــ گھر کا دروازہ کھلا تھا آنگن میں شاہ آبادی پتھروں کا فرش تھا۔ آنگن میں نورتی پر دو بڑے بڑے پیتمبر رکھے ہوئے تھے ـــــ یہاں پانی کا ایک لوٹا پڑا تھا آنگن کے بیچ میں یلاّ ریڈی کی لاش تھی ـــــ سر الگ تھا ـــــ دھڑ الگ تھا اور دیواروں سے دھواں اٹھ رہا تھا ـــــ یلاّ ریڈی کی آنکھیں کھلی تھیں اور راگھو راؤ جب تک آنگن میں کھڑا رہا ـــــ مبہوت ہو کر ان آنکھوں کی طرف دیکھتا رہا ـــــ پھر بڑی مشکل سے اس نے اپنی نگاہیں وہاں سے اٹھائیں اور سر جھکا کے آہستہ سے اس کے گھر سے باہر نکل گیا۔

راگھو راؤ مقبول کی جانب سے یلاّ ریڈی کے لئے ایک پیغام لایا تھا مگر پیغام دینے کی ضرورت پیش نہ آئی یلاّ ریڈی نے خود بخود ہی اس پیغام کے ایک ایک نقطہ کو پورا کر کے دکھا دیا تھا۔

گاؤں سے نکل کر وہ بودھن جنگل کی طرف ہولیا راستے میں اُسے پہلے بہت سے باجرے کے کھیت جلے ہوئے ملے ارنڈ کے ایک بوٹے کے پاس اسے ایک جوان لڑکی کی لاش ملی جسے ایک گیدڑ کھا رہا تھا گیدڑ اس کی آہٹ پاکر زور سے بھاگا ـــــ اور چٹانوں کو پھلانگتا ہوا ـــ پتھروں کو لڑھکاتا ہوا ٹیلے کے دوسری طرف چلا گیا۔

راگھو راؤ نے لاش کو گھسیٹ کر ایک کھیت کی مینڈھ کے کنارے رکھ دیا اور پھر مینڈھ کو توڑ کر اس کی مٹی اور پتھر لاش پر ڈال کر اسے دبا دیا اور ہاتھ پاؤں جھاڑ کر آگے چلا گیا ـــــ اس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں اور اس کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے اور اسے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اور اس وقت وہ پانی کی بجائے لہو بھی پی سکتا تھا۔

بودھن جنگل کے گھنے سایوں میں اس کے جسم کی حدت کچھ کم ہوئی سایہ دار درختوں میں پرندے بول رہے تھے یا اس کے اپنے پاؤں کی چاپ تھی، یا جھاڑیوں کے اندر خرگوشوں کی سرسراہٹ تھی ـــــ ورنہ چاروں طرف سناٹا تھا اور ایک موہوم سی پگڈنڈی نشان راہ بنی ہوئی جنگل کے بیچ میں سے گزرتی جاتی تھی۔

راگھو راؤ کے کان اس سناٹے میں خوب چوکنے ہو گئے تھے ـــ وہ محتاط بھی تھا اور چوکنا بھی ـــــ اور کچھ امید بھی کرتا تھا کہ اگر کوئی سراغ

ملے گا تو یہیں ملے گا۔

کبھی کبھی چلتے چلتے اسے واہمہ ہوتا جیسے درختوں کے پیچھے کئی آنکھیں اسے گھورتی ہوئی دیکھ رہی ہیں جیسے کئی ہاتھ اس کی پیٹھ میں چھرا بھونکنے کے لئے پیچھے سے اٹھ رہے ہیں ـــــ وہ معاً گھبرا کے دیکھتا ـــــ مگر وہاں تو کوئی نہ تھا۔ جنگل میں وہ بالکل اکیلا تھا۔

ایک بڑے ٹیلے پر سیلو کی گھنی جھاڑیاں تھیں جب وہ اس ٹیلے کے قریب سے گزرنے لگا تو کسی نے آواز دے کر کہا۔

"ٹھہر جاؤ ـــــ"

راگھو راؤ ٹھہر گیا۔

پھر ٹیلے پر اس نے ایک عورت کو کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا

سیاہ فام بڈھا سنگلاخ چہرہ

سر پر سفید بال

ہاتوں میں بندوق

اونچا لانبا قد

عورت نے بندوق سیدھی کی۔

راگھو راؤ نے اسے پہچان لیا۔ چلاّ کے بولا

"کاشما ـــــ!"

عورت نے بندوق کی نال نیچے کرلی اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کے اُسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔

راگھو راؤ چلایا۔

"میں راگھو راؤ ہوں ـــــ راگھو راؤ ـــــ مقبول کا ساتھی ....."

عورت ٹیلے سے نیچے دوڑنے لگی اس کے پیچھے پیچھے تین چار مرد ٹیلے کے عقب سے نکل کر بھاگے چلے آرہے تھے۔

راگھو راؤ کے بالکل قریب آکے کاشما نے اسے پہچانا وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے بولی

"ارے بہت کمزور ہوگئے ہو بیٹا ـــــ میں تمہیں پہچان نہ سکی ـــــ"

راگھو راؤ نے کہا

"جیل کوئی ماں کا گھر تھوڑی ہوتا ہے ماں۔"

کاشما بولی۔

"تم کب رہا ہوئے ـــــ"

راگھو راؤ نے کہا

"پرسوں ـــــ"

کاشما نے پوچھا

"مقبول خیریت سے تو ہے ـــــ"

کاشما کے لہجہ میں شفقت تھی ـــــ بڑی گہری مامتا تھی ـــــ بڑی سچی پیار تھی۔

راگھوراؤ کو اپنے حلق میں کوئی چیز پھنستی ہوئی معلوم ہوئی ـــــ یہ عورت جو یلا ریڈی کی ماں تھی جس کی لاش کو وہ ابھی کریم نگر کے گاؤں میں دیکھ کے آیا ہے یہ ماں راگھوراؤ کی خیریت دریافت کر رہی ہے مقبول کی صحت کے بارے میں پوچھ رہی ہے ـــــ مگر اپنے بیٹے کیلئے اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے ـــــ جو کسانوں کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا اس کے لئے کچھ نہیں کہتی۔

اس لئے راگھوراؤ نے صاف صاف پوچھ لیا۔

یہ واقعہ کب ہوا ہے؟

کاشما نے بات کو پلٹ کے کہا۔

ہمارے گاؤں کا واقعہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے جہاں جہاں کسان سبھاؤں نے جاگیرداروں اور دیشمکھوں کو ان کا حصہ دینے سے انکار کیا ہے وہاں یہی کچھ ہوا ہے۔ اور شاید اس سے بھی بدتر ہمارے گاؤں میں تو حملہ رات کو ہوا اس لئے رات کی تاریکی میں وہ لوگ گاؤں جلا گئے دن میں ذرا مشکل ہوتا ـــــ مگر ایک بات یہ بھی ہوئی کہ رات کی تاریکی میں بہت سے کسانوں کو گاؤں سے بھاگ کر جنگل میں پناہ لینے کا موقعہ

مل گیا وہ سب کچھ اس وقت میرے ساتھ ہیں۔"

راگھو راؤ کاشما کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا چہرے پر کوئی خوف نہیں تھا —— کوئی ڈر نہیں تھا —— وہ بڑی دلچسپی سے باتیں کر رہی تھی ——

یلا ریڈی کی ماں سچ مچ نئی ماں تھی۔

وہ اس کی بے باکی اور بے خوفی کی کئی داستانیں سن چکا تھا۔ کس طرح وہ خود کسان سبھا میں یلا ریڈی کے خلاف بھی آواز بلند کر دیتی تھی، کیونکہ یلا ریڈی ایک کھاتا پیتا کسان تھا —— اور کئی باتوں میں وہ حالات کو سمجھنے سے انکار کر دیتا تھا ایسے موقعوں پر اس کی ماں ہی اسے راہ راست پر لاتی تھی۔

راگھو راؤ نے کاشما کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور اسے تیلگو کی وہ پرانی ضرب المثل یاد آئی جو اچھی عورت کی تعریف میں تھی اس ضرب المثل کے اعتبار سے اچھی عورت وہ ہوتی ہے جو کام کرنے میں داسی ہو — صلاح دینے میں وزیر ہو —— محبت کرنے میں رمبھا ہو —— اور کھانا کھلانے میں ماں ہو —— اور لڑنے میں سپاہی ہو۔

راگھو راؤ نے سوچا۔

مگر یہ تو نئی ضرب المثل کی بات تھی اور آندھرا کے گاؤں میں جگہ جگہ

کاشما ایسی باتیں پرانی ضرب المثل کو بدل کے نئی کہاوتوں کو جنم دے رہی تھیں
کاشما نے کہا۔
"اب کیا ہوگا ——— کسان تو ڈر کے مارے جنگلوں میں جا کر چھپ گئے ہیں۔"
راگھو راؤ نے کہا۔
"مقبول نے کہا تھا اور دوسرے ساتھیوں کا کہنا بھی یہی ہے کہ اب مالیہ نہ دینے اور جاگیرداری ٹیکس نہ دینے کا زمانہ گزر گیا اب کسان بھاؤں کو سیدھے سیدھے زمین کسانوں میں بانٹ دینی چاہیئے۔ جن کے پاس زمین نہیں ہے۔ وہ اگر ایسے وقت میں بھاگ کے جنگلوں کی پناہ نہ لیں گے تو کیا کریں گے گاؤں میں ان کا کیا ہے جس کی وہ حفاظت کرتے پھریں انہیں گاؤں میں زمین دو ———"
"ٹھیک ہے ———"
کاشما کے پیچھے کھڑا ہوا ایک آدمی بولا
راگھو راؤ کو شکل و صورت سے وہ جنگل کا کویا معلوم ہوا ———
"زمین جنگل کے باسیوں کو بھی ملنی چاہیئے ——— ہم کویا لوگوں کو بھی ملنی چاہیئے ——— پھر جنگل اور گاؤں کا رشتہ بہت مضبوط ہو جائیگا۔"
"ٹھیک ہے ———"

راگھو راؤ بولا۔

" آندھرا کے جنگلوں نے غیر ملکی سامراج کے خلاف کوئی کم لڑائی نہیں لڑی ہے جنگلی قبیلوں کے سردار الوری سیتارام راجو کی لڑائی کو آندھرا کا بچہ بچہ جانتا ہے آج بھی لوگ کہتے ہیں کہ جہاں جہاں آندھرا کے جنگل ہیں وہاں الوری سیتارام راجو آج بھی زندہ ہے اور بہادر کویاؤں کو سامراج کے خلاف لڑائی پر ابھار رہا ہے۔

کاشما کے ساتھیوں میں سے ایک مادیگا (چمار) تھا دوسرا مالا (کھیت مزدور) وہ دونوں ایک دم بول پڑے۔

" ہاں ہاں —— ٹھیک ہے —— جب زمین ہماری ہو جائے گی۔ پھر دیکھیں گے کون مائی کا لال کسان کے ہات سے اس کی زمین چھین کے لے جاتا ہے زمین کو گاؤں کے مادیگے اور مالے بھی لیں گے —— "

راگھو راؤ نے کہا۔

" وہ سب سے پہلے لیں گے —— دراصل زمین تو اسی کی ہوتی ہے جو اس پر محنت کرتا ہے —— "

کاشما نے تھوڑی دیر کے لئے سوچا

پھر مڑ کر اپنے پیچھے کھڑے ہوئے کویا سے بولی

" راتوں جنگل میں سب کسانوں کو خبر کردو ہم سب لوگ واپس کریم نگر

جائیں گے وہاں پر زمین کسانوں میں بانٹی جائے گی ـــــ"

راؤل دوڑتا ہوا چلا گیا ـــــ مادیکا اور مالا بھی اس کے پیچھے پیچھے خبر کرنے کیلئے چلے گئے۔

راگھو راؤ نے کہا۔

" ہاں مجھے پیاس لگی ہے ـــ "

کاشما ٹیلے کے پیچھے سے مٹی کا ایک مٹکا اٹھا کے لائی راگھو راؤ نے اسے منہ سے لگایا اور آدھا کر دیا ـــــ پانی پی چکنے کے بعد اس نے کہا۔

" ہاں تم یہ سب کرو گی نا ـــــ کہیں تمہاری مدد کے لئے رک جاؤں"

کاشما نے کہا۔

" نہیں راگھو ـــــ تم جاؤ ـــــ میں سب کروں گی ـــ "

جب راگھو چلنے لگا ـــــ تو اس نے دیکھا کہ کاشما ٹیلے کی اوٹ میں بیٹھی ـــــ بندوق گھٹنوں پر رکھے اسے عجیب نگاہوں سے دیکھ رہی ہے مگر راگھو راؤ نے اس کا زیادہ خیال نہیں کیا وہ اپنے رستے پر بڑھ گیا ـــــ

یکایک کاشما نے اسے پیچھے سے پکارا۔

" سنو راگھو ـــــ "

راگھو راؤ نے مڑ کر دیکھا ——— مگر کاشما چپ تھی عجیب نگاہوں سے خلا کو گھورے جارہی تھی۔

کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد آخر کاشما دبیں بیٹھے بیٹھے آہستہ سے بولی
" کیا اس کی آنکھیں ابھی تک کھلی تھیں ——؟

راگھو راؤ کا سر گھوم گیا —— اس کے ذہن میں چند جلی ہوئی دیواریں آئیں —— شاہ آبادی پتھروں کا فرش —— فرش پر ایک لاش —— دھڑ الگ —— سر الگ —— دو آنکھیں منجمد اور پتھریلی —— ایک سوال بن کر اس کی آنکھوں کو تاکتی ہوئیں ——

وہ اپنے منہ سے کچھ نہ کہہ سکا —— اس نے نہایت آہستہ سے اپنا سر ہلا دیا۔

کاشما کچھ دیر خلاء میں گھورتی رہی پھر اس کا سفید سر اس کے گھٹنوں پر جھک گیا —— آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر بندوق کی نال پر چپ چاپ بہتے گئے۔

راگھو راؤ کا جی چاہا —— مگر اس نے اپنے جی کو روک لیا۔

اور کاشما کو اکیلے چھوڑ کر اپنے رستے پر بڑھ گیا —— یہ بات نہ تھی کہ وہ انسان نہیں تھا —— یہ بات بھی نہیں تھی کہ اس کے دل میں آنسو نہیں تھے —— یہ بات بھی نہیں نہیں تھی کہ وہ اپنے ساتھی یلاّ ریڈی سے

پیار نہیں کرتا تھا ـــــ

مگر ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے رستہ پر چلا گیا تو اس کے ذہن میں صرف دو خیال تھے۔

ایک خیال یہ کہ انسان کی ترقی کا راستہ کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے کتنے رستے ہوئے زخموں ـــــ کتنے بہتے ہوئے آنسوؤں ـــــ کتنے تڑپتے ہوئے دلوں کو مسوس کر انسان کا ایک قدم بلکہ آدھا قدم ـــــ بلکہ آدھے کا آدھا قدم ـــــ بلکہ آدھے کے آدھے کا آدھا قدم آگے بڑھتا ہے

ایک خیال یہ کہ دوسرا خیال وہ کہ کاشما ایک نئی ماں ہے اس کی تڑپتی ہوئی ممتا ضرور ایک نیا رستہ ڈھونڈ لے گی جس میں جب ایک بچہ مرتا ہے تو آغوش اتنی وسیع ہو جاتی ہے کہ ہزاروں بچے اس ماں کی آغوش کی پنہائیوں میں سمٹ آتے ہیں اس لئے راگھو راؤ کو کاشما سے کوئی ڈر نہ تھا اس لئے وہ چپ چاپ کاشما کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو چھوڑ کر اپنے رستہ پر چلا گیا۔

بہت آگے جا کے راگھو راؤ کو ایک خیال آیا اور اب اس کال کوٹھری میں اسے یاد کر کے اس کا چہرہ مسرت سے کھل گیا کیونکہ اس خیال کے آتے ہی . اس پر عمل کرتے ہی راگھو راؤ نے بہت سے آنسوؤں کو شادمانی میں تبدیل کر دیا تھا اور وہ خیال یہ تھا کہ وہ ایک پیغام کا ہرکارہ ہی کیوں

بنے، کیوں نہ اس پیغام پر ساتھ ساتھ عمل کرتا جائے
چنانچہ اس نے بیلم پلّی کے گاؤں سے خود زمین بانٹنے کے کام میں حصہ لیا خود اپنی آنکھوں سے اس نے بے گھر اور بے زمین کسانوں کو خود اعتمادی خوشی اور کامرانی کے جذبوں سے سرشار ہوتے ہوئے دیکھا جلے ہوئے جھونپڑے پھر سے آباد ہونے لگے ـــــ گاؤں میں صفائی کے لئے نالیاں کھودی جانے لگیں ـــــ زمینوں میں ہل چلنے لگے اور کسان کا سینہ اتنا وسیع ہوگیا کہ ظالموں کو اس سے ہیبت محسوس ہونے لگی جو کل کے جابر تھے اور حاکم تھے ـــــ اور صدیاں کے مالک تھے وہ دُم دبا کر گاؤں گاؤں سے رخصت ہونے لگے۔ اور بڑے بڑے شہروں میں پناہ لینے لگے۔

بیلم پلّی کے کسانوں نے راگھو راؤ کے ساتھ ایک دستہ کسانوں کا کر دیا جو اسے دوسرے گاؤں میں زمین تقسیم کرانے میں مدد دے گا
اس طرح جوں جوں راگھو راؤ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں بڑھتا گیا اس کے ساتھ گاؤں کے کسانوں کا ایک جم غفیر ہوتا گیا ـــــ ایک لہر تھی جو روکے نہ رکتی تھی ـــــ ایک سیلاب تھا جو امڈا چلا آرہا تھا وہ قدم جو پہلے آدھے کے آدھے کا آدھا اٹھتا تھا اب دیووں کی طرح جست لگانے لگا۔ اس سیلاب کے قدم دھرتی پر تھے اور سر آسمان پر تھا

اور اس کے گیت کی گونج سارے جہان میں تھی پہلے کسان دھرتی میں ہلا چلاتا تھا آج آسمان اس کی جیب میں تھا اور بنکو کے سارے کنگرے ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے تھے۔

بیلم پلی سے پتی پاڈو اور پتی پاڈو سے سری پورم تک زندگی کا ایک جشن فروزاں تھا جس کی نظیر اس نے اپنی دھرتی پر آج تک کبھی نہ دیکھی تھی اسے محسوس ہوا جیسے جیل کی دیوار کا ایک کونہ آج بھی اسی مسرت سے روشن ہے۔

وہ سفید جھاگ کے جھکوں کو جھنجھوڑتا ہوا طوفان اس کال کوٹھری کے اندر بھی گھسا چلا آرہا تھا جو اسے ڈولتی ہوئی کلغی دار لہروں پر بٹھا کے سری پورم لے گیا تھا۔

پتی پاڈو سے سری پورم تک!

راگھوراؤ نے ماضی کی طرف پلٹ کر، کسانوں کے اس لمبے جلوس کو دیکھا جو پتی پاڈو سے سری پورم تک پھیلا ہوا تھا آگے آگے کویا والنیٹروں کا دل تھا ــــــ اس کے پیچھے گواؤں کا دل تھا ــــــ ان کے پیچھے ہی

دیٹوں کی قطاریں تھیں

پھر جھنڈے والے تھے۔

شنکھ پورنے والے تھے۔

ڈھول بجانے والے تھے۔

ان کے پیچھے جلوس کے بیچ میں ایک رنگین منقش بند پالکی تھی جس

کے دو طرف لال لال ریشم کے پردے سرسرا رہے تھے

اس بند پالکی کے اندر کاغذات تھے ـــــ کاغذ جن پر زمینیں گرد کی گئی تھیں ـــــ زندگیاں گرو کی گئی تھیں ـــــ عصمتیں گرد کی گئی تھیں اور یہ سب کاغذ صدیوں کی غلامی کے جابر ظلم ـــــ کسانوں نے زمینداروں کے کانپتے ہوئے ہاتوں سے چھین لئے تھے۔ اور کئی جگہ انہیں چھیننے کی بھی ضرورت نہ پڑی تھی ـــــ زمیندار خود ہی اپنی بنگلو، اپنی گڑھی اپنے ظلم کے حصار ـــــ خالی چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

اس پالکی کے پیچھے ایک کھلی پالکی میں لوگ راگھو راؤ کو لے جا رہے تھے بلکہ لے جاتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ راگھو راؤ نے پیدل چلنے پر بہت اصرار کیا تھا مگر لوگ نہیں مانے تھے ـــــ اس کی پالکی کے پیچھے ناگیشور کی پالکی تھی جو جیل سے رہا ہو کے پتی پاڈو کے مقام پر اپنے دوست سے آملا تھا۔

ان کے پیچھے بھی کسانوں کا جم غفیر تھا۔ ڈھول بجانے والے تھے رقص کرنے والے تھے اور خوشی سے گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگانے والے تھے۔ بچے بوڑھے کسان عورتیں لڑکے اندھے لنگڑے اپاہج سب اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے ـــــ آج کسی کے گھر پر تالا نہ تھا ـــــ آج کوئی چور نہ تھا ـــــ کوئی مجرم نہ تھا ـــــ آج

وہ سب زمین کے مالک تھے

آہستہ آہستہ ریشم کے پردوں سے سرسراتی ہوئی بند پالکی زمیندار کی بنکو کے دروازے پر پہنچ گئی ــــ لوگوں نے پالکی کو بنکو کے اندر لے جا کے اتارا .... بنکو کے اندر گاؤں کی عورتیں پہلے ہی سے موجود تھیں انہوں نے پالکی کی آرتی اتاری ــــ پھول برسائے ــــ پیسے وار کے پھینکے اور سواگت کے بھجن گائے۔

راگھو راؤ اس منظر کو دیکھتا ہی رہ گیا ــــ کئی بار اس نے اپنے دل میں سوچا تھا کہ جب اس کے گاؤں میں انقلاب آئے گا تو پھر کیا ہوگا ــــ ہزار تصوّر سے اس نے اپنے دل میں انقلاب کو آتے دیکھا تھا۔

کبھی ایک بپھرے ہوئے طوفان کی طرح۔

کبھی ایک اڑتی ہوئی فوج کی طرح۔

کبھی لاکھوں سنگینوں پر لاشوں کے انبار اٹھائے ہوئے۔

مگر اس کے تصوّر نے کبھی اس طرح نہ دیکھا تھا۔ کہ جب انقلاب اس کے گاؤں میں آئے گا۔ تو ایک شرمیلی دلہن کی طرح ــــ لال لال پردوں کے پیچھے ــــ ایک پالکی میں بند ہو کے آئے گا ــــ اور کوئی آرتی اتارے گا۔ اور کوئی شنکھ بجائے گا۔ اور عورتیں بھجن گائیں گی ــــ اور بہادر کسان

کی بندوقوں پر سیندور کے تلک لگائے جائیں گے۔

اور پھر راگھو راؤ نے سوچا

یہ اس کی بھول تھی ـــــ جو اس نے ایسا سوچا تھا ـــــ ہندوستان میں تو انقلاب ہندوستانی طریقے سے آئے گا ـــــ وہ ہمارے تمدّن ہمارے مزاج ہمارے کلچر، ہمارے دیس کے گیتوں میں اور اس کی خوشبوؤں میں رس بس کے آئے گا۔ اس کی شکل بدیسی نہیں ہوگی اس کی بول چال کا طریقہ ہم سے الگ نہیں ہوگا۔ وہ ہوگا انوکھا، نیا، مختلف ایسا جو کبھی نہ ہوا تھا۔ کبھی نہ سنا تھا کبھی نہ دیکھا تھا مگر اس کے باوجود وہ سر سے پاؤں تک ہندوستانی ہوگا اور ہم اس کو پہچان کر کہہ سکیں گے

ہاں یہ انقلاب ہمارا ہے ـــــ ہاں یہ انقلاب ہمارا ہے۔!

عین اس وقت گاؤں کے سب سے بوڑھے آدمی نارائن نے راگھوراؤ کے ہاتھ میں پٹواری کی جریب دے دی اور اس سے کہا۔

"بیٹا — زمین کی تقسیم شروع کردو —"

راگھوراؤ نے جریب ہاتھ میں لے کے کہا

"اس موقعہ پر اپنے گاؤں کے پٹواری کو یہاں ہونا چاہیئے تھا — کہاں ہیں شری راما پنتلو —"

اس پر زور کا ایک قہقہہ بلند ہوا۔ کسی نے کہا

"وہ تو زمیندار کے پٹواری تھے کچھ ہم غریب کسانوں کے پٹواری تھوڑے

تھے۔ ان کی جریب ہمیشہ ہمارے خلاف چلتی تھی اس لئے وہ تو زمیندار جی کے ساتھ ہی چلے گئے۔

"اور گاؤں کے پردہت شری شیارام شاستری کہاں ہیں ——"

راگھو راؤ نے پوچھا

"اس شبھ اوسر پر ان کا آشیرواد بہت ضروری ہے ——"

پھر ایک زور کا قہقہہ بلند ہوا۔

ناگیشور بولا۔

"پردہت جی زمیندار کا راج تلک ہوتا تو ضرور دکھائی دیتا —— مگر آج تو کسانوں کا راج تلک ہے ——"

بہت سے کسان ایک دم بے صبری سے بول اٹھے۔

"راگھو راؤ جلدی کرو —— زمین کے معاملے میں ہم کسی پردہت پٹواری کا انتظار نہیں کر سکتے۔ ہم نے صدیوں سے آج کے دن کا بڑی بے صبری سے انتظار کیا ہے ——"

راگھو راؤ جریب کو ہاتھ میں لے کے بولا

"تو بجاؤ ڈھول تاشے —— اور چلو کھیتوں کی طرف —— آج سے سری پورم کے کسانوں کی جیتر یاترا شروع ہوتی ہے۔

راگھو راؤ کے قدم بڑھانے پر ڈھول بجنے شروع ہو گئے۔ کسان خوشی

سے دیوانے ہو گئے ــــــ بڑے بڑے بڈھے خوشی سے رونے لگے اور ہنسنے لگے۔ ایسی مسرّت آج تک کسی نے نہ دیکھی تھی عورتوں نے جیتر یاترا کا گیت شروع کیا۔ کسانوں نے اسی گیت میں اپنی بھرپور آواز شامل کردی اور گیت کی گھن گرج ساری فضا میں گونج گونج گئی۔

آ بُرُد گنڈے پیری کی کنڈا — بزدلی اور کمزوری
ایرو گن نٹّی آندھرا پُتر — آندھرا کے بیٹے نہیں جانتے
نی جات کی ایدی پریکشا — آج ہماری قوم کا امتحان ہے
راگ ویلاگ ساگ رہیتو — اٹھو اور شامل ہو جاؤ
ساگ اندیکا جیتر یاترا! — وہ جیت کا جلوس جا رہا ہے

راگھوراؤ نے اپنی آنکھ کے کونے سے آنسو کا ایک قطرہ آہستہ سے پونچھ دیا۔ وہ دن جب دھرتی کسان کو ملی —— اور اس سے اگلے چار دن جب سری پورم میں زمین کی تقسیم کا کام جاری رہا —— راگھوراؤ کی زندگی کے بہترین دن تھے۔ زمین کی تقسیم میں چھوٹے چھوٹے جھگڑے بھی ہوئے تھے۔ کوئی یہ ٹکڑا چاہتا تھا —— کوئی دوسرا۔

کوئی اپنی ضرورت سے زیادہ کا طالب تھا —— اور کوئی اپنی زیادہ زمین کو کم کرکے بتا رہا تھا —— مگر گاؤں کے بڑے بوڑھوں اور پنچوں کی مدد سے

جو زمین کی ایک ایک رگ سے واقف تھے ـــــ یہ معاملہ بڑی خوش اسلوبی سے سلجھ گیا۔

اس موقعہ پر راگھو راؤ کو اپنے باپ دیریا کی حرکتیں یاد آئیں راگھو راؤ نے اپنے دل میں فیصلہ کیا تھا کہ اس کے باپ کو سب سے آخر میں زمین ملے گی ـــــ جب گاؤں کے باقی سب کسانوں کو زمین مل چکے گی اس وقت جو کچھ بچے گا اس میں سے دیریا کو زمین ملے گی۔ کیونکہ وہ راگھو راؤ کا باپ تھا۔

مگر دیریا اس بات کو مطلق سمجھ نہ سکتا تھا ـــــ اس لئے وہ زمین تقسیم ہوتے وقت بار بار راگھو راؤ کے سامنے آجاتا اور بڑی ہی بے صبری سے ایک بچہ کی طرح ٹھنک کے اپنے لئے زمین کا مطالبہ کرتا اور راگھو راؤ آہستہ سے مسکرا کر جریب کو ہات میں لے کر آگے بڑھ جاتا اس پر دیریا اپنے بیٹے کی سرد مہری پر پریشان ہوکر دوسرے کسانوں سے اپنے بیٹے کے متعلق شکایت کرتا ـــــ کئی بار دو چار کسانوں نے راگھو راؤ سے کہا بھی ـــــ کہ وہ اپنے لئے سب سے پہلے زمین انتخاب کرے۔ وہ اس کے باپ کو گاؤں کی سب سے اچھی زمین کا ایک ٹکڑا دینے کو تیار تھا مگر راگھو راؤ نے مسکرا کر اسے ٹال دیا۔

سب سے آخر میں جب دیریا قریب قریب مایوس ہو چکا تھا کہ شاید

اس کے حصے میں کوئی زمین آئے گی بھی یا نہیں ـــــ اس وقت ویریا کو زمین ملی۔

اور جتنی زمین اس نے اپنے لئے اور راگھو راؤ کے لئے ـــــ اور راگھو کی ہونے والی بیوی کے لئے ـــــ اور راگھو اور اس کی بیوی کے آنے والے بچوں کے لئے سوچی تھی ـــــ اس سے زیادہ زمین گاؤں کے پنچوں نے راگھو راؤ کی مرضی کے خلاف ویریا کے حوالے کر دی۔

ویریا بھاگتا ہوا ـــــ خوشی سے ناچتا ہوا ـــــ اپنے کھیتوں کے بیچ میں چلا گیا اس نے اپنے ہاتوں میں کھیت کی بھربھری مٹی کو اٹھا لیا اور اسے ہوا میں بکھیرتے ہوئے بولا ـــــ

یہ زمین میری ہے ـــــ یہ زمین میری ہے۔

پھر وہ بھاگتا ہوا اپنے بیٹے کے پاس آیا ـــــ اور اس سے بغل گیر ہو کر رونے لگا۔!

کسانوں کو زمین مل گئی تھی۔
سب مسرور تھے۔
خوش تھے ـــــ لیکن منحوسیت کے سیاہ سائے ابھی ان کے سروں پر منڈلا رہے تھے ـــــ!
ٹھکوں کے مکینوں نے سرکار سے امداد طلب کر لی تھی۔
وہ یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ گاؤں کے وٹی زمینوں پر قابض ہو جائیں ـــــ!
وٹی ـــــ آخر وٹی ہیں ـــــ!

ان کو مالکوں کے سامنے سر اٹھا کر چلنے کی ہمت ہو ہی نہیں سکتی۔

وہ دلتی رہیں گے ــــ!

اور پھر ایک رات قیامت کی رات بن گئی۔

گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔

خون بہنے لگا۔

دلتی ایک بار پھر دلتی بنائے جانے لگے۔

جوان گرفتار ہوئے ــــ

بچے اور بوڑھے بھی ــــ وہ دلتی جو تھے۔ بنکو کے باہر پہر

لگ گیا ــــ

اور اسی ہنگامے میں راگھوراؤ بھی گرفتار ہو کر جیل کی آہنی سلاخو

کے پیچھے پہنچ گیا۔

اس کا جرم بڑا تھا ــــ!

بہت بڑا۔

جسے معاف نہ کیا جا سکتا تھا ــــ!

وہ دلتیوں کا حامی تھا ــــ انہیں ان کا حق دلانے کا

اسی کے سر تھا ــــ!

پھر وہ بے قصور کیسے ہوتا۔

سرکار پولیس اسے کیسے معاف کرتی۔
بنکو کے مکین اسے کیسے بخش دیتے—!

اور پھر
جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے اس نے اپنی آنکھیں موندلیں
ابھی صبح ہونے میں کافی وقت تھا—!

کال کوٹھری کا دروازہ پھر کھلنے لگا ـــــ

راگھو راؤ نے سلاخوں کے پرے اپنے باپ کا چہرہ دیکھا اس کے پیچھے بڈھے وارڈر کا چہرہ تھا ـــــ جس کی گہری سیاہ آنکھوں میں پانی چمک رہا تھا۔

ویریا آہستہ آہستہ اپنے بیٹے کی طرف بڑھا ـــــ اس کے قریب آکے رک گیا ـــــ

راگھو نے آہستہ سے اپنا منہ پھیر لیا اور آہستہ سے کہا

" بیٹھ جاؤ باپو ـــــ "

دیریا اور راگھو راؤ دونوں کال کوٹھری کے فرش پر بیٹھ گئے۔
دیریا کے ہونٹ کانپ رہے تھے
اس کے ہاتوں کی مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔
اس کا سر ایک عجیب انوکھے انداز میں آہستہ آہستہ ہل رہا تھا ——— وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا ——— مگر شاید کچھ بھی نہ کہہ سکتا تھا ——— اس کی عجیب حالت کو دیکھ کر راگھو راؤ کا دل بھر آیا۔
بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر اپنے باپ سے پوچھا
" گاؤں کا کیا حال ہے ——— "
" گاؤں میں اب کوئی نہیں رہا ——— جتنے نوجوان تھے ——— وہ سب گرفتار کر لئے گئے۔ جو باقی بچے وہ جنگلوں میں جا چھپے ——— جہاں دن رات فوج اور پولیس انہیں گرفتار کرنے جاتی ہے۔ پھر کبھی آدھی رات کے وقت جنگل سے گولی چلنے کی آواز آتی ہے اور بڈھی پولما کہتی ہے
" ایک اور گیا ——— "
اور پھر ہنس کر قہقہے لگاتی ہے۔
" بڈھی ماں پولما ——— ؟"
راگھو راؤ نے پوچھا
" ہاں پولما پاگل ہو گئی ہے ——— "

راگھوراؤ چند لمحوں کے لئے خاموش رہا پھر بولا

"اور جگن ناتھ ریڈی ــــ"

"زمیندار تو اپنی بنگلوے باہر نہیں نکلتا فوج اور پولیس کا سب سے بڑا پہرہ تو بنگلو پر ہے یا چنگی کے ناکے پر ــــ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جانے کیلئے ہر کسان کو اس ناکے پر تلاشی دینی پڑتی ہے۔"

اس کے بعد پھر چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی ــــ پھر ویریا کے ہونٹ کانپنے لگے۔

وہ آہستہ سے بولا۔

"گاؤں والے کہتے تھے اپیل نامنظور ہوگئی ــــ"

"ہاں ــــ"

راگھوراؤ بولا

"رنگڈو دھوبی کہتا تھا کہ جگن ناتھ ریڈی اس سے کہتا تھا کہ راگھوراؤ معافی مانگ لیتا تو یہ سزا نہ ہوتی ــــ"

"کس بات کی معافی ــــ"

راگھوراؤ نے غصہ سے کہا

ویریا نے ملتجیانہ لہجہ میں کہا

"میں تو کچھ نہیں کہتا رنگڈو والا کہتا تھا۔"

" اور تم کیا کہتے ہو باپو —— "

راگھو راؤ نے پوچھا

دیریا آہستہ آہستہ رکتے رکتے بولا

" کبھی کبھی میں سوچتا ہوں جو کچھ تو نے کیا ٹھیک کیا —— کبھی کبھی میں
(سو)چتا ہوں میرا ایک ہی بیٹا ہے —— "

دیریا نے سر جھکا لیا۔

راگھو راؤ نے اپنے باپ کے کندھے پر ہات رکھ کے کہا۔

" باپو —— تو نے مجھے بنکو کی نفرت دی تھی —— کیا تو آج اس
(نفر)ت کو لوٹا لینے آیا ہے۔ "

" نہیں —— "

دیریا کے منہ سے بے اختیار نکلا

" مگر بیٹا —— میں ایک ان پڑھ جاہل کسان ہوں —— کبھی کبھی میں
(سو)چتا ہوں تو مجھے معلوم نہیں ہوتا —— کس لئے میرا ایک ہی بیٹا مجھ
(سے) چھن گیا ہے کبھی کبھی جنگل سے جب گولی چلنے کی آواز آتی ہے تو
(مجھے) بہت کالی معلوم ہوتی ہے۔

راگھو راؤ نے اپنا ہات باپ کے کندھے سے اٹھایا نہیں بلکہ اس
(کی) گرفت اپنے باپ کے کندھے پر اور مضبوط ہو گئی۔

وہ آہستہ سے بولنے لگا۔ جیسے ایک ایک لفظ اسے سمجھا رہا ہو

" باپو ـــــ تجھے وہ میلہ یاد ہے جب رامیا سیٹھ کی دکان پر کھڑے میں نے ریشم کے کپڑے کو ہات لگا دیا تھا اور رامیا سیٹھ نے گالیاں دی تھیں ـــــ اور تو نے ریشم کے تھان سے میرا ہاتھ کھینچ لیا تھا ـــــ شاید تو اس وقت اپنے لڑکے کی دل کی حالت جانتا تھا جو نا تھ ریڈی کے لڑکے پرتاپ ریڈی کی طرح ریشم کی قمیض پہننا چاہتا شاید تو اپنے دل میں تو جانتا تھا کہ ریشم وڈیوں کے لئے نہیں ہے۔ گاڑھا ادھر ہے اور سارا ریشم ادھر ہے ساری بھوک ادھر ہے اور اناج ادھر ہے ـــــ ساری بے حرمتی ادھر ہے اور ساری عزت ہے ـــــ باپو تیرے لڑکے کا گناہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اس ریشم کے تھان کو چھونے کی کوشش کی ہے۔

جب انسان ریشم کے کوئے ـــــ گندم کے خوشے اور کھیت کی لئے روئے گا نہیں ـــــ جب یہ ساری ملائمیت انسان کے مقدر میں ہو گی دور رس نگاہ رکھنے کی پاداش میں تیرے بیٹے کو کل صبح سات بجے پھانسی دی جائے گی ـــــ بس اس کے سوا اور میرا کوئی گناہ نہیں ہے۔ "

دیریا رونے لگا۔

راگھو راؤ نے کہا۔

" باپو اگر تو روئے گا۔ تو دنیا کیا کہے گی —— گاؤں والے کیا کہیں
—— زمیندار کی بنکو تجھے دیکھ کر کتنی خوش ہوگی —— "

دیریا نے آنسو پونچھ ڈالے

راگھو راؤ دیر تک دیریا کو سمجھاتا رہا ——

اتنے گہرے التفات اور محبت سے اس نے آج تک کبھی اپنے باپ
ات نہ کی تھی —— جیسے وہ آج سب کچھ اپنے باپ کے دل میں
دینا چاہتا تھا۔

جو کچھ وہ تھا —— جو کچھ اس نے سوچا تھا —— جو کچھ وہ نہ کر
تھا —— مگر کرنا چاہتا تھا —— وہ سب کچھ آج اپنے باپ کے
ں ڈال کے رخصت ہونا چاہتا تھا۔

ریشم کی قمیض کی بات اس کی باپ کی سمجھ میں آتی تھی اس لئے اس
نے باپ کو حیدرآباد کے قصے سنائے —— کس طرح اس کا دل ریشم
کرنے مچلتا تھا۔ اس کے لئے کس طرح جتن کر کے وہ روپے اکٹھے
تا تھا۔ مگر کبھی کچھ ہو گیا —— کبھی کچھ ہو گیا —— اور وہ
اپنے دل کی حسرت پوری نہ کر سکا۔

بڑی معمولی سی بات تھی —— مگر ان معمولی معمولی سی باتوں کے
—— ریشم کی ایک قمیض کے لئے —— اناج کے ایک دانے کے لئے

عزت کی ایک مسرت کے لئے۔
حسن کی ایک کرن کے لئے۔

دیٹوں کی دنیا میں ویرانی ہے ـــــ کب تک اس ویران
میں سناٹا رہے گا ـــــ کوئی اوپر سے آنے والا نہیں ہے ـــــ کو
کی حالت کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے ـــــ اس کام کو خود دیٹی لوگو
کرنا ہوگا۔ ورنہ ہزاروں سال کی طرح آج بھی ریشم اُدھر رہے گا۔
عریانی ادھر رہے گی۔

بہت دیر تک راگھوراؤ اپنے باپ کو سمجھاتا رہا ـــــ اس کا باپ
غور سے اس کی باتیں سنتا رہا ـــــ دونوں باپ اور بیٹا ـــــ بالکل
دوسرے کے اس طرح قریب ہوکر انہماک سے گفتگو کر رہے تھے جیسے د
کوٹھری میں نہیں ـــــ اپنے گاؤں کے رتس بنڈے میں بیٹھے ہوں

یکایک کسی نے کال کوٹھری کے دروازے کو ہلایا ـــــ اور راگ
اور دیریا دونوں چونک گئے۔

دروازے پر بڈھا وارڈر کھڑا تھا ـــــ وہ معافی کا خواستگار
کہنے لگا۔

• اب میری ڈیوٹی ختم ہونے والی ہے ـــــ اس لئے دیریا کو
جانا ہوگا ـــــ نئے وارڈر نے دیکھ لیا تو ٹھیک نہ ہوگا ـــــ د

ہنسے۔ ویریّا اٹھ کھڑا ہوا راگھوراؤ اس سے بغلگیر ہوا ویریّا نے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا ——

" صبح وہ پھر آئے گا۔ گاؤں سے لوٹ کر —— "

" مگر تم اب گاؤں جاتے ہی کیوں ہو یہیں شہر میں پڑ رہو۔ یا جیل کے باہر کہیں سو جاؤ —— "

ویریّا بولا۔

" نہیں — میں گاؤں میں چلا جاؤں گا۔ صبح آجاؤں گا —— آج رات بھر اگر میں جیتا ہی رہوں تو ٹھیک ہے ورنہ ....

ویریّا فقرے کو پورا کئے بغیر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

ویریا جب واپس گاؤں میں پہنچا تو گاؤں میں سب لوگ سو گئے تھے صرف پولما کے کمرے میں چراغ روشن تھا اور دروازہ کھلا تھا۔

وہ آہستہ سے پولما کے گھر میں داخل ہو گیا اور اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ پگلی پولما ابھی تک جاگ رہی ہے اور اس کی آنکھوں میں بڑی بے چینی اور اضطراب تھا۔ ویریا کو دیکھ کر پولما فوراً کھاٹ سے اتر کر اس کے پاس آ گئی۔ اور اس سے سرگوشی میں بات کرنے لگی۔

"کیسا ہے میرا لڑکا ـــــ"

پولما نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا

"اچھا ہے۔ تمہارے پاؤں چھوتا ہے —"

"جیتا رہے — میرا لال۔ جگ جگ جیئے۔"

پولما کے منہ سے بے اختیار نکلا

پھر وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ پھر بے اختیار ایک کھوکھلی ہنسی ہنسنے لگی — دیریا اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

پھر پولما ہنستے ہنستے رک گئی — اور دیریا کی طرف دیکھ کر بولی

"دیریا — میں پگلی نہیں ہوں — ہاں کبھی کبھی میرا دل اس طرح گھبرانے لگتا ہے کہ مجھے ہنسنا ہی پڑتا ہے نہ ہنسوں تو مر جاؤں —"

دیریا چپ رہا۔

پولما اس کی طرف دیکھ کر بولی

"ضرور تمہارے دل میں کوئی بات ہے — میں تمہیں جانتی ہوں ضرور تمہارے دل میں کوئی بات ہے — جو تمہیں چبھ رہی ہے — بتاؤ کیا بات ہے۔"

دیریا بولا۔

"نہیں ماں — کوئی بات نہیں ہے —"

"ضرور ہے بتاؤ — ورنہ میں چیخ چیخ کر ہنسوں گی"

دیریا نے رکتے رکتے کہا۔

"ہاں میرا خیال ہے۔ میرا بیٹا ریشم کی قمیض پہننا چاہتا ہے۔"

"ریشم کی قمیض ——"

پولما ہنسی —— ریشم کی قمیض —— کیسی باتیں کرتے ہو —— کیا راگھو راؤ نے خود تم سے کہا تھا۔"

"نہیں ماں —— اس نے تو کچھ نہیں کہا —— مگر میرا ایسا خیال ہے کہ اگر میں اسے ریشم کی قمیض پہنا سکوں تو وہ مرتے سمے بہت خوش ہوگا۔"

پولما زور زور سے ہنسنے لگی

"ریشم کی قمیض ہا ہا ہا —— ریشم کی قمیض —— یہ بھی خوب مذاق رہا —— ہا ہا ہا —— دیریا تم تو شروع سے احمق تھے —— ریشم کی قمیض ہا ہا ہا —— اس گاؤں میں کس کے پاس ریشم کی قمیض ہے —— دیریا تم تو بالکل احمق ہو ——

پولما زور زور سے ہنسنے لگی پولما

دیریا نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"تم نہیں سمجھتی ہو پولما —— تم میرے ایک باپ کے دل کو نہیں سمجھتی ہو —— مجھے یاد ہے جب میں نے اپنے بچے کو تاڑ کا بگل خرید کے دیا تھا۔ اس وقت راگھو نے کسی خوشی سے میری طرف دیکھا تھا اس کا

ایک ایک کھلونا مجھے یاد ہے تم جانتی ہو —— وٹی اپنے بیٹے کو زیادہ کھلونے نہیں دے سکتا —— کھلونے بہت کم وٹی کے لڑکے کی زندگی میں آئے ہیں —— کھلونوں کی حسرت زیادہ رہ جاتی ہے آج جب میرا بیٹا میرا جوان بیٹا —— بائیس سال کا راگھو راؤ ریشم کی قمیض کی بات کر رہا تھا میں نے اس کی نگاہوں میں وہی بچپن کی چمک دیکھی —— وہی حسرت، وہی شوق —— جو باپ کے دل کو مٹھی میں پکڑ لیتا ہے تو توال ہے —— پولما تو تو۔ کیا یہ سب کچھ نہیں جانتی ——

پولما نے سر جھکا لیا اور بولی۔

"میرے تو سب مر گئے —— ایک بھی نہ رہا —— کچھ کال میں مارے گئے —— کچھ پلیگ کی نذر ہو گئے —— کچھ جیلوں میں سڑ گئے —— جو باقی بچے انہیں زمیندار کے ظلم نے کھا لیا —— میرے تو سب مر گئے ویریا۔ اب میں کچھ نہیں جانتی ——۔"

ویریا نے کہا۔

"اس گاؤں میں کس کے پاس ریشم کی قمیض ہو گی ——؟"

پولما پھر زور زور سے ہنسنے لگی —— وہ اتنے زور زور سے چیخی کہ آس پاس کے جھونپڑوں سے دو چار کسان ڈرتے ڈرتے باہر نکل آئے ویریا کو دیکھ کر ان کی ڈھارس بندھی۔

پوچھنے لگے۔

"کیا بات ہے پگلی کیوں ہنس رہی ہے۔"

پولما بولی

"پگلی میں ہوں یا یہ ـــــ جو کہتا ہے مجھے اپنے بیٹے کیلئے ریشم کی قمیض چاہیئے۔"

دیریا نے سارا قصہ ان کسانوں سے کہا ـــــ

ڈرتے ڈرتے وہ کسان بولے ـــــ

"دیریا ـــ ہم تیرا دل سمجھتے ہیں مگر اس وقت ریشم کی قمیض کہاں سے آئے گی۔ اور کس کے پاس ہے یہ ریشم کی قمیض ـــــ کیا فضول باتیں کرتا ہے صبح راگھوراؤ کو پھانسی ہونے والی ہے اور تو ریشم کی قمیض ڈھونڈ رہا ہے راگھوراؤ نے اگر سن لیا تو خفا ہوگا ـــــ کہ اس کا باپ اس کے مرنے پر کیسی حرکتیں کر رہا ہے ـــــ"

ایک کسان نے کہا۔

"گورما کی شادی ہونے والی ہے ـــــ اگلے ماہ ـــــ چلو اس کے باپ سے پوچھیں شائد شادی کیلئے اس نے ریشم کا کوئی کپڑا لیا ہو دیریا کے دل کی بات بھی پوری ہو جائے گی۔"

دوسرے کسان نے کہا۔

"تم بھی نرے احمق ہو —— گورما کے باپ کے پاس ریشم کا کپڑا خریدنے کو پیسے کہاں ہیں بیوقوف نہ بنو۔"

ویریا نے جھجکتے جھجکتے کہا

"آخر پوچھ لینے میں کیا حرج ہے۔"

دو تین کسان ویریا کے ساتھ گورما کے گھر جانے کو تیار ہو گئے۔ ایک بڈھے نے کہا۔ اگر پولیس آگئی —— اگر وہ لوگ پوچھنے لگے یہ گاؤں والے رات کو کیا کھسر پھسر کر رہے ہیں تو کیا ہوگا۔"

ایک کسان نے چمک کے کہا۔ "وہ دیکھا جائے گا۔ تم چلو جی گورما کے گھر ——"

جہاں جہاں سے یہ لوگ گزرے کسان جاگنے لگے۔ اور ان کے ساتھ ہی ہوتے گئے ـــــ ریشم کی قمیض کا چرچا بڑھتا گیا۔

جب یہ لوگ گورما کے گھر پہنچے تو وہاں خبر پہلے سے لگ چکی تھی اس نے ہات جوڑ کے کہا۔

" یہ کھاٹ پر سارے کپڑے رکھے ہیں ـــــ جو میں نے اپنی گورما کے بیاہ کے لئے تیار کئے ہیں ان میں سے ایک بھی ریشم کا کپڑا نہیں ہے اور بھی میرے گھر کی تلاشی لے لو راگھو راؤ کے لئے ریشم کی تیشف کیا میں تو اپنی جان تک دینے کے لئے تیار ہوں ـــــ "

وہاں سے رخصت ہوکر لوگ ادھر ادھر ٹوہ لینے لگے ـــــ تھوڑے عرصہ میں ہر گھر میں کپڑے دیکھے جانے لگے اور اب سارے گاؤں کو کہیں نہ کہیں سے ریشم کی قمیض پیدا کرنے کی جستجو ہوگئی۔

بڑے بوڑھے جو تھے وہ سب سے زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ جو نوجوان تھے اسے وہ دیریا کی حماقت سمجھتے تھے۔ مگر اس موقعہ پر وہ بھی ساتھ تھے۔

گھروں میں بند دروازوں کے پیچھے صلاح و مشورے ہونے لگے اتنے میں راملو دھوبی دوڑتا ہوا دیریا کے پاس آیا اس کے پاس میلے کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک گٹھڑی تھی ـــــ وہ گٹھڑی اس نے دیریا کے سامنے کھول دی اور اس سے کہا۔

"اس میں دو ریشم کی قمیضیں ہیں ـــــ ایک جگن ناتھ ریڈی کی ہے۔ ایک پرتاپ ریڈی کی ـــــ"

دیریا نے نفرت سے کہا۔

"میرا بیٹا زمیندار کی قمیض پہنے گا۔ راملو ـــــ تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو ـــ"

راملو نے پریشان ہو کے کہا ـــــ

"اور اس گاؤں میں ریشم کی قمیض کہاں سے آئے گی؟"

دیریا چپ ہو گیا ـــ

بہت سے نوجوان واپس چلے گئے۔

یکایک دیریا کو کچھ یاد آیا ـــــ اور وہ اپنے جھونپڑے کی طرف دوڑتا ہوا چلا گیا۔

جھونپڑے میں رکھے ہوئے کاٹھ کے صندوق کو کھول کے اس نے اپنے بوسیدہ کپڑوں کو باہر نکالا سب سے نیچے اس کی بیوی کے کپڑے رکھے تھے جو اس کی بیوی کے باپ نے اسے جہیز میں دیئے تھے اور سب کپڑے تو پھٹ چکے تھے صرف ریشم کی ایک اوڑھنی رہ گئی تھی جو راگھو کی ماں نے اپنی بہو کے لئے رکھ چھوڑی تھی۔

وہ بڑے فخر سے کبھی کبھی اپنے خاوند کو یہ اوڑھنی دکھایا کرتی اور کہتی ”ہے کسی دیٹی کے پاس ایسی اوڑھنی ـــــ یہ اوڑھنی میں اپنے بیٹے کی شادی میں اپنی بہو کو دوں گی ـــ“

دیریا نے بڑی احتیاط سے صندوق کی سب سے نچلی تہوں سے یہ سلوٹوں بھری اوڑھنی نکالی۔

لال رنگ کی خوبصورت اوڑھنی۔

پرانا ریشم تھا ـــــ اس لئے اچھا تھا ـــــ چراغ کی روشنی میں اس کی چمک نے سب کی نظروں کو خیرہ کر دیا بہت سے نوجوان ایکدم

خوشی سے یوں چلا اٹھے ــــ جیسے انہوں نے کوئی مورچہ فتح کر لیا ہو

" قمیص مل گئی ــــ "

دیریا نے پوچھا

" اس اوڑھنی کی قمیص بنے گی ــــ "

ایک کسان بولا

" کیوں نہیں بنے گی ــــ سوم آپا درزی کو اسی وقت بلاؤ۔ وقت بہت کم ہے ــــ "

ایک کسان درزی کو جگانے گیا ــــ تھوڑی دیر کے بعد وہ سوم آپا کو ساتھ لئے دوڑتا دوڑتا آیا سوم آپا نے کپڑا دیکھ کے کہا۔

" یہ کم ہے اس سے قمیص نہیں بنے گی ــــ بنڈی بن سکتی ہے "

نوجوانوں نے چلا کے کہا۔

" تو بنڈی ہی بناؤ ــــ مگر جلدی کرو ــــ "

سوم آپا نے کہا۔

" میں مشین کو گھر بھول آیا ہوں ــــ "

ایک کسان مشین لینے اس کے گھر پر گیا اتنے میں سوم آپا کپڑے کی تہیں کھول کر اسے دیکھنے لگا۔ اسے دو تین سوراخ نظر آئے جنہیں کیڑوں نے کھا لیا تھا۔

دیریا نے گھبرا کے پوچھا

"اب کیا ہوگا ——؟"

سوم آپا نے مسکرا کر کہا ——

"کوئی بات نہیں —— میں اس طرح کاٹوں گا کہ یہ سوراخ نکل جائیں گے۔ راگھو راؤ کی قمیص میں کوئی سوراخ نہیں ہوگا۔"

اتنے میں مشین آگئی —— سوم آپا نے بڑی احتیاط سے ریشم کی اوڑھنی کو قینچی سے کاٹا اور مشین میں تاگا ڈال کر اسے چلانے لگا جب سوم آپا مشین چلا رہا تھا تو آدھا گاؤں اس کی طرف دیکھ رہا تھا ایسی عجیب وغریب قمیص اس نے آج تک نہیں سی تھی اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ریشم کے ہر ہر تار کے ساتھ گاؤں والوں کے سانس سیئے جا رہے ہیں —— ان کی ساری امیدیں —— ساری آرزوئیں اس ریشم کی سلوٹوں سے باہر جھانکنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

ایک دفعہ —— جب مشین چلاتے چلاتے سوم آپا کے ہاتھوں سے تھوڑا سا ریشم پھٹ گیا —— تو سینکڑوں دلوں سے اتنی زور کی آہ نکلی جیسے ان کا دل بھی ساتھ میں پھٹ گیا ہو۔

سوم آپا —— اس کے بعد بڑی ہی احتیاط کے ساتھ مشین چلانے لگا۔

ایک عورت بولی

" سوم آپا جلدی کرو جب تم قمیض تیار کر چکو گے تو ہم اس پر پھول کاڑھیں گی ـــــ "

نوجوان نے تعجب سے اس عورت کی طرف دیکھا

عورت نے کہا۔

" یہ استری سبھا کا فیصلہ ہے ـــــ "

اس کے بعد وہ قمیض دیوتا کے بیٹے کی نہیں رہی سارے گاؤں کے بیٹے کی ہو گئی ــــ پانچ عورتوں نے گیت گاتے ہوئے اس پر پھول پتیاں کاڑھیں ــــ سینے پر درانتی اور ہتھوڑے اور گندم کی بالی کا نشان بنایا عورتوں نے قمیض کو تلک لگایا ــــ کچھ عورتوں نے اتنے میں پھولوں کے ہار بنا لیے تھے قمیض کو ان پھولوں کے ہاروں میں رکھ دیا گیا

اتنے میں کسی کو خیال آیا کہ اور تو سب کچھ ہوا لیکن اس قمیض کو لوہا نہیں لگایا گیا ــــ لوہے سے استری کرتے کرنے کی مشین سوم آبا کے پاس بھی نہیں تھی وہ صرف زمیندار کے درزی کے پاس تھی جس کا گھر بنکو کے

پچھواڑے تھا ــــــ وہاں کون جائے گا ــــــ کیونکہ پولیس کا پہرہ بالکل قریب تھا۔ اور اس وقت اگر انہیں آہٹ ہوگئی ــــــ شائد آہٹ تو انہیں اس وقت بھی ہوگئی ہوگی ــــــ شائد وہ کسی حملے کی توقع کر رہے ہوں

دو کسانوں نے کہا۔

" وہ بنکو کے پچھواڑے جائیں گے اور زمیندار کے درزی سے استری مانگ کے لائیں گے ــــ"

جب وہ دونوں کسان چلے گئے تو رنگٹو وٹی نے کہا۔

"جنگل میں خبر کر دو ــــــ گاؤں گاؤں خبر کر دو ــــــ ہم سب لوگ یہ ریشم کی قمیض لے کر جیل خانے جائیں گے ــ ۔"

تھوڑی دیر میں سارا گاؤں رتس بنڈے میں جمع ہوگیا ــــ

مشعلیں جل رہی تھیں

نعرے لگائے جا رہے تھے۔

اب کسی کو زمیندار کا اور اس کے حواریوں کا ڈر نہ تھا اور جب وہ دونوں کسان لوہے کی استری لے کے آئے تو ان میں سے ایک کی ٹانگ گولی سے زخمی ہوگئی تھی اس وقت تو لوگ کے جوش کا پارہ بہت بڑھ گیا اور بڑے جوش سے نعرے گاؤں میں گونجنے لگے

اور پھر ان نعروں کی گونج دوسرے گاؤں تک پہنچ گئی ــــ اور وہاں

سے ان نعروں کا جواب آنے لگا۔

لوہا پھیرنے کے بعد قمیض کو ہاروں سے سجایا گیا

اتنے میں پتی یا ڈنہ گاؤں سے بڑا کتھا کہنے والے ڈھول بجانے والے

اور دوسرے کسان جوق در جوق آ پہونچے

اور کسانوں کا جوش لمحہ بہ لمحہ بڑھتا گیا۔

وہ رات کسی کو نہیں بھولے گی

اس رات کو جب مشعلیں جگاتے ہوئے ——— پانچ ہزار کسانوں کا

جلوس زمیندار کی بنکو کے قریب سے نکلا تو وہاں کوئی نہ تھا

زمیندار اپنے حمایتوں سمیت بنکو سے غائب ہو چکا تھا

راستے میں جہاں جہاں کوئی گاؤں آتا لوگ اس عجیب و غریب جلوس میں

شامل ہوتے گئے زمیندار ہر گاؤں سے بھر شہر کو بھاگتے گئے لوگوں کے نعرے

اونچے ہوتے گئے اور جلوس تیز تیز قدموں سے جیتریا ترا کی طرح جیل کی طرف

بڑھتا گیا جیل جو صرف ایک رات کی مسافت تھا۔

صبح کے بالکل قریب ——— !

صبح کے بالکل قریب جب راگھوراؤ کو وہ قمیض ملی تو اس نے بڑی حیرت سے اپنے باپ کی طرف دیکھا

حیرت، مسرت، استعجاب اور اچنبھے کے ملے جلے جذبات سے اس کا سینہ معمور ہو گیا اور جب اس کے باپ نے اسے بتایا کہ کن کن مصیبتوں سے یہ قمیض تیار ہوتی ہے اور کس طرح دس ہزار کسانوں کا جلوس اس قمیض کو اٹھائے ہوئے جیل کے دروازے تک آیا ہے

تو راگھوراؤ کا دل بہجت سے لبریز ہو گیا اس کی گہری آنکھوں میں امید

مستقبل اور اجالے کی لازوال چمک پیدا ہو گئی اور اس نے ایک بیٹے کی طرح اپنے باپ کے کندھے پر سر رکھ دیا ـــــ اور اس کے باپ نے زور سے اپنے بیٹے کو چھاتی سے لگا لیا۔

پھر دیریا نے کہا۔

"وقت کم ہے ـــــ اب تم یہ قمیض پہن لو ـــــ یہ میری خواہش ہے اور گاؤں والوں کی بھی خواہش ہے اس کے اوپر پھر تم چاہے جیل کے کپڑے پہن لینا ـــ"

راگھو راؤ مسکرا کر جیل کے کپڑے اتارنے لگا۔ اور بڑی آہستہ آہستہ احتیاط سے وہ بنڈی نما لال ریشم کی قمیض پہننے لگا ـــــ اور جب وہ قمیض پہن رہا تھا اس کا باپ بڑے فخر سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ رہا تھا اور بیٹے کے دل میں بھی مختلف جذبات کا تلاطم تھا

لال ریشم کی قمیض پہن کر راگھو راؤ نے محسوس کیا جیسے وہ صرف ایک قمیض نہیں پہنے ہوئے ہے۔ اپنے عوام کا جھنڈا اور ان کی جدوجہد کا عظیم نشان پہنے ہوئے ہے۔

جیسے وہ اپنا خون پہنے ہوئے ہے۔

اپنے کھیت پہنے ہوئے ہے۔

اپنے باپ کی شفقت اور اپنی ماں کا سہاگ پہنے ہوئے ہے۔

راگھوراؤ کا سینہ مسرّت سے دونا ہو گیا اور اس نے لال لال ریشم کی نرم و گداز ملائمیت کو چھوتے ہوئے محسوس کیا۔

جیسے یہ نرم نرم لمس لطیف نوید ہے ہزاروں شہوت کی ڈالیوں پر سرسراتے ہوئے ریشم کے کویّوں کا انسان کے دل میں تارِ عنکبوت کی طرح چمکتی ہوئی لاکھوں آرزوؤں اور تمناؤں کا ـــــ پتلی پتلی نسوانی انگلیوں پر گھومنے والے زرفشاں جال کا ـــــ جس کے سائے میں جنت کے جھومر جھلکتے ہیں ـــــ

لال ریشم کی قمیض پر ہاتھ پھیرتے ہوئے راگھوراؤ نے بڑے غرور اور پیار سے باپ کی طرف دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ صبح کے اجالے نے ایسے زور سے رات کے رخسار پر چپت لگائی ہے کہ جیل کا سارا لوہا گل کر بہہ گیا ہے۔ اور صرف چند سلاخیں باقی رہ گئی ہیں ـــ

اور پھر دوسرے لمحہ میں اس نے سلاخوں کے اس پار سورج کو آسمان کے سینے سے اس طرح نمودار ہوتے دیکھا جیسے ماں کے آنچل سے بچّہ ہمک کے نمودار ہوتا ہے ـــــ

اور اس نے خوشی سے چلّا کر باپ سے کہا۔

"باپو ـــــ دیکھو ـــــ دیکھو ـــــ جیل کی سلاخیں بھی سورج کو نہیں روک سکیں ـــــ"

دیرتیا کی آنکھوں میں آنسو آگئے
لیکن اس نے ان مقدس آنسوؤں کو روکا نہیں ـــــ اس نے ان آنسوؤں
کو اپنے بڈھے چہرے پر بہنے دیا ـــــ
دار ڈوں میں گھرا ہوا اس کا بیٹا راگھوراؤ اپنے ماتھے پر صبح کی شبنم
اور دل میں سورج لئے ہوئے پھانسی کے تختے کی طرف بڑھتا گیا۔ جلوس
کی صدائیں جیل کی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر فضا میں گونجتی گئیں۔

ادی گدی گو	دیکھو
کھدالندلیکا تلنگانہ	سارا تلنگانہ بیدار ہے
مردگم پورن بھیری	طبل بجاؤ
ساگم پو جیترِ یاترا۔	جیت کے جلوس کی رہبری کرو
سادھن جیمو دجے لکشمی	مورچہ جیت لو
ساگی رتو آندھرا پترا	آندھرا کے بیٹو آؤ۔

جیل کے باہر جو گیت گونج رہا تھا
جیل کے اندر بھی وہی گیت ویّریا کے ہونٹوں سے
پھوٹ نکلا ——
گیت گاتے گاتے دیّریا کو محسوس ہوا جیسے اس کے اندر ایک جھنڈا
اگ رہا ہے —— جس پر شہیدوں کے چہرے گندم کی سنہری بالیوں کی طرح

چمک رہے ہیں ـــــ

گیت گاتے گاتے ویریّا کے دل میں یہ خیال مضبوط ہوتا گیا کہ جب تک آندھرا کا کسان زندہ ہے اس کے دل کا جھنڈا اور گیت زندہ ہے ــــ اس کا بیٹا بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔

اور ـــــ

اس کے گاؤں میں کبھی ویشں مکھ واپس نہیں آئے گا۔!

برِصغیر کی جانی پہچانی ادیبہ

واجدہ تبسم

کا ایک تازہ ترین ناول ــــ جس کے بھارت میں دو ماہ میں چھ ایڈیشن شائع ہوئے

خوابوں کے جنازے

ایک کہانی :- جو ایسی ہی محسوس ہو گی جیسے یہ آپ کا اپنا افسانہ ہے۔
ایک ناول :- جو اس معاشرے کے استحصال کے خلاف بغاوت ہے

اس ناول میں وہ سب کچھ موجود ہے۔ جس کی آپ کو تلاش ہے۔

سفید کاغذ ، آفسٹ طباعت ، چار رنگا سرورق

مجلد قیمت :- ۱۳/ روپے

انتخاب ادب ۱۰ ایبک روڈ انار کلی لاہور

محترمہ عصمت چغتائی کا ایک ناول

جس میں

دل دھڑکتے ہیں ——— اور جذبات چنگھاڑتے دکھائی دیں گے۔

سودائی

ان چند ناولوں میں سے جو ذہن پر دائمی نقش ثبت کر دیتے ہیں۔

عصمت چغتائی کا دعویٰ ہے کہ یہ ناول ان کی تحریروں میں سب سے جاذبِ توجہ اور خوبصورت تحریر ہے۔

اردو ادب میں زندہ رہنے والی تحریر

سودائی

سفید کاغذ، آفسٹ طباعت، دیدہ زیب کتابت، مجلد قیمت ۱۰/- روپے

ناشران :- انتخاب ادب ۱۰- ایبک روڈ انارکلی لاہور

دنیا بھر کے رسائل

بُک کارنز

سکولوں کالجوں کی

کتابیں

کاپیاں

ڈائجسٹ

کتابیں

رجسٹر

کارڈز

پین

براہ

ان سرمایہ داروں کی کہانی ... جو دولت مند ضرور ہوتے ہیں مگر عقل مند نہیں۔

اردو ادب کے امام کرشن چندر

نے انہیں ایک گدھے سے زیادہ اہمیت نہیں دی

جناب کرشن چندر کا ایک نیا ناول جسے پاکستان میں پہلی بار شائع کرنے کا شرف ہمیں حاصل ہے۔

ایک گدھا نیفا میں

گدھوں کے عشق... گدھوں کی یو این او... گدھوں کی سیاست۔
گدھوں کی انسانی فوج سے جدید آلات حرب کے ذریعے جنگ... گدھوں کے عالمی دورے... اور گدھوں کی کانفرنسیں اور مذاکرات امن۔
اس کتاب کو پڑھنے کے بعد شاید آپ بھی اپنے آپ کو اسی صف میں شامل خیال کریں
سفید کاغذ۔ آفسٹ طباعت۔ چار رنگا سرورق۔ مجلد قیمت: ۸ روپے

انتخاب ادب ۱۰ ایبک روڈ انارکلی لاہور